خوبیون کو پیش کرکے اسے اردو مین رائج کرنیکی صلاح دیگئی ہے، اس سلسلہ مین بھاشا کے عروض پر کسی قدر تفصیلی اور انگریزی عروض پر اجمالی بحث ہے، بعض اور اصلاحی تجویزین ہین، اس سے انکار نہین کہ اردو شاعری اپنی بہت سی اچھی خصوصیات کے باوجود نقائص سے خالی نہین ہے، لیکن دوسری زبان کی شاعری کو اس کیلئے معیار قرار دینا صحیح نہین ہے، ہر قوم ہر ملک اور ہر زبان کی خصوصیات، ذوق اور رجحانات جدا جدا ہین، اسلئے ایک زبان کا ادب دوسری زبان کے ادب کے لئے بعینہٖ معیار نہین بن سکتا، قدیم اردو شاعری مین یقیناً بہت سے نقائص تھے، لیکن نئے رجحانات نے بہت کچھ خود انکی اصلاح کردی ہے، اور جس حد تک اسکی گنجایش باقی ہے، اس حد تک اس مضمون کی بعض تجویزین قابلِ قبول ہین، اور نہ صرف بھاشا کی شاعری، بلکہ ہر زبان کی شاعری کی اچھی خصوصیات قابلِ تقلید ہین، لیکن اردو شاعری کا رنگ اور ڈھانچہ بدل کر اُسے کسی دوسرے دائرہ کا پابند بنا دینا خود اصلاح و ترقی کے منافی ہے، گو اس مضمون کے تمام خیالات قابلِ قبول نہین ہین، تاہم شعر و ادب سے متعلق اسمین بہت سی مفید باتین ہین، نظم کے مجموعے مین ۴۰ نظمین ہین، ان مین بشیر مرحوم کی طبعزاد اور بعض دوسری زبانون کے تراجم ہین، یہ سب نظمین جدت طرازی، زبان کی سادگی، گھلاوٹ، شیرینی اور رسیلے پن کا نمونہ ہین،

یادِ اقبال جناب غلام سرور صاحب فگار، تقطیع بڑی، ضخامت ۱۲۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد عہ، غیر مجلد ۱۲/، دفتر اقبال اکیڈمی ظفر منزل تاجپورہ لاہور،

سر اقبال مرحوم کی وفات پر ان کی یاد مین ہندوستان کے بہت سے شعراء نے اپنی عقیدت کے نذرانے پیش کئے تھے، اقبال اکیڈمی نے جو مرحوم کی تعلیمات کی نشر و اشاعت کیلئے قائم ہوئی ہے، ان عقیدت ناموں کو جمع کرکے "یادِ اقبال" کے نام سے شائع کر دیا ہے، اسمین اہم شعراء کی نظمین ہین، مولانا حسرت موہانی کی ایک نظم جو انھون نے اپنی بیوی کی وفات پر کہی تھی، غلطی سے اس مین شامل ہوگئی ہے، معلوم ہوتا ہے مرتب نے بے پڑھے اسکو شامل کر لیا ہے، اسلئے کہ اس نظم کے بعض اشعار اور جذبات کا تعلق کسی حیثیت سے بھی اقبال مرحوم سے نہیں ہو سکتا، "م"

"جلد ۴۸" ماہ ربیع الاول سنہ ۱۳۶۰ھ مطابق ماہ اپریل سنہ ۱۹۴۱ء "عدد ۴"

مضامین

شذرات

سرشاہ سلیمان!

نئی تعلیم نے جو بہتر سے بہتر نمونے ہماری قوم میں پیش کئے اُن میں سے ایک سرشاہ سلیمان تھے، وہ مشرقی تعلیم کے ایک ممتاز خاندان کے فرد فرید تھے، ان کا آبائی وطن ضلع اعظم گڈھ ہی کا ایک ممتاز قصبہ تھا، ملا محمود جونپوری جن کا نام شمس بازغہ اور فرائد کے مصنف کی حیثیت سے آفتاب کی طرح درخشان ہے ان کے مورث اعلیٰ تھے، سر سلیمان مرحوم نے بھی ابتدائی مشرقی تعلیم حاصل کی تھی، اور عربی تعلیم سے بہرہ ور تھے، ملا محمود نے فلسفہ مین ادب کی، اور ادب مین فلسفہ کی شان پیدا کی تھی، یہی خصوصیت سر سلیمان کی ذات مین تھی، ایک طرف وہ قصائد ذوق اور مثنویات میر کو ترتیب دیتے تھے اور دوسری طرف آئینسٹائن کے نظریہ پر نقد و تبصرہ کرتے تھے۔

سر سلیمان کی فطری ذہانت بے نظیر تھی، ذہانت کی بجلی ان کی رگ رگ مین بھری تھی، وہ نہ صرف ہائیکورٹون کے جج رہے، بلکہ قانون کے نکتہ شناس بھی تھے، ان کی لیاقت و قابلیت کی شرح کیلئے چند سطرین کسی طرح کافی نہین ہوسکتین، اور ان سب باتون کے ساتھ وہ مسلمان بھی تھے، ایماناً اور عملاً مسلمان! وہ ان تنگ ظرفون مین نہ تھے جو رومن حروف کے چند الفاظ پڑھ لینے کے بعد اپنے کو علم و معارف کا سب سے بڑا عارف مان کر دین و مذہب سے بے نیاز ہوجاتے ہین، اور بندگی کی حد سے آگے بڑھ کر خدائی کے عرش کا اپنے کو مستحق سمجھنے لگتے ہین، مرحوم مین ان خوبیون کے ساتھ بہت سی اخلاقی خوبیان

بھی جمع تھین، وہ منکسر، متواضع، حلیم، اور سادہ مزاج تھے، ساتھ ہی اپنی رائے کے مضبوط، اور کام کے دھنی تھے، وہ عالم تھے، مگر عمر بھر طالب العلم بنے رہے،

مرحوم ہندوستان کا وقار اور مسلمانون کا فخر تھے، افسوس کہ ۱۲ر مارچ ۱۹۴۱ء کو ہمارے ملک کا یہ وقار اور ہماری قوم کا یہ فخر جاتا رہا، گلے کی ایک معمولی بیماری نے خناق کی اور خناق نے غالباً دماغ کے پھوڑے کی شکل اختیار کی، ۱۸۸۶ء پیدائش کا سال تھا، پچپن برس کی عمر مین اس دنیائے فانی کو الوداع کہا، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۰ دنیاوی قانونون کا جج اب دلون کے سب سے بڑے قاضی القضاۃ اور احکم الحاکمین کی بارگاہِ عدالت میں ہے، دعا ہے کہ وہ احکم الحاکمین جو ارحم الراحمین بھی ہے اپنی شفقت و رحمت کی کرسی پر اس کو جگہ دیگا، اور اپنی بخشش و بخشایش کی عزت سے سرفراز فرمائیگا،

۲ر مارچ ۱۹۴۱ء کو ریاست رامپور اپنی پرانی علم پروری اور علمی سرپرستی کے ثبوت مین اعلیحضرت نواب صاحب رامپور کے نام نامی سے نسبت دیکر رضا اکاڈیمی کے نام سے ایک علمی مجلس کا افتتاح کر رہی تھی، اُسکی صدارت کے لئے مرحوم سرشاہ سلیمان کا انتخاب ہوا تھا، مرحوم نے اپنا خطبہ صدارت لکھ لیا تھا کہ بیمار پڑے اور جلسہ کی صدارت نہ کرسکے، مگر ان کا خطبہ مجلس مین آیا اور پڑھا گیا، آج ہم مرحوم کے اس خطبہ کو اُن کی علمی زندگی کی آخری یادگار کے طور پر شائع کرتے ہین،

رضا ایکاڈیمی رامپور کا افتتاح ۲ر مارچ ۱۹۴۱ء کو ظہر کے بعد ریاست کے ایک خوشنما قطعہ میدان مین ہوا جس کے پاس ہی وہ مختصر مگر پاکیزہ سرکاری عمارت تھی جو ایکاڈیمی کو دیگئی ہے، اعلیحضرت سرکار رامپور بنفس نفیس شریک مجلس تھے اور ریاست کے تمام اعلیٰ عہدہ دار اور ممتاز اہل علم حاضر تھے،

ملک کے بعض مشہور ادارون کے نمایندے بھی خاص طور سے بلائے گئے تھے، چنانچہ انجمن ترقی اردو، جامعہ ملیہ اور دار المصنفین کے نمایندون کے علاوہ مسلم یونیورسٹی، دلی یونیورسٹی اور لکھنؤ یونیورسٹی کے مشرقی علوم کے بعض اساتذہ بھی تشریف رکھتے تھے،

اکاڈیمی کا افتتاح کلام پاک کی تلاوت سے ہوا، پہلے اعلیٰحضرت کی خدمت مین اکاڈیمی کے صدر جسٹس مولوی معین الدین صاحب انصاری (فرنگی محلی) نے سپاسنامہ پیش کیا، پھر اعلیٰحضرت نے اپنا جواب ارشاد فرمایا، پھر مختلف قومی علمی ادارون کے نمایندون اور یونیورسٹیون کے استادون نے تبریک و تہنیت اور رامپور کے گذشتہ علمی خدمات اور آیندہ توقعات پر مختصر تقریرین کین، اور آخر مین اکاڈیمی کے ناظم مولانا امتیاز علی خان صاحب عرشی نے سر شاہ سلیمان کا خطبہ پڑھ کر سنایا، اور اسی پر جلسہ ختم ہوا، یہ اکاڈیمی اعلیٰحضرت نواب صاحب رامپور کی موروثی علمی قدردانی، اور عالی مرتبت سید بشیر حسین زیدی بالقابہ چیف منسٹر کی علم دوستی کا نتیجہ ہے، خدا کرے کہ یہ نومولود بچہ اپنے سرپرستون کے زیر سایہ اپنی ترقی کی منزلین طے کرے،

خیال تھا کہ اس نمبر میں مولوی مسعود عالم صاحب ندوی (کتابدار بانکی پور لائبریری) کی نئی تصنیف سیرۃ محمد بن عبد الوہاب کا ایک باب پیش کیا جائے گا، مگر سر شاہ سلیمان مرحوم کے یادگار آخری خطبہ کے بروقت اشاعت کے خیال سے اس کو روک لینا پڑا، مولوی مسعود عالم صاحب بڑی محنت اور تحقیق، کاوش اور دیدہ ریزی سے محمد بن عبد الوہاب کی ایک ایسی سوانحعمری مرتب کر رہے ہین جس سے صاحب سوانح کے تمام کارنامے سامنے آجائین اور دوستون اور دشمنون دونون کی غلطیان زائل اور غلط فہمیان دور ہو جائیں، اور مشرق و مغرب میں جو کچھ اس کے متعلق لکھا گیا ہے اس پر محققانہ تبصرہ بھی ہو جائے، اور معلوم ہو جائے کہ اس تحریک کا اصل منشا کیا تھا، اور وہ کہان تک کامیاب ہوئی۔

مقالات

تدوینِ حدیث

از

مولانا مناظر احسن گیلانی صدر شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ

مولانا نے یہ مقالہ نائب امیر جامعہ عثمانیہ کی فرمایش پر بطور توسیعی لکچر کے پڑھا تھا، جو مجموعۂ "تحقیقات علمیہ جامعہ عثمانیہ" میں چھپ چکا ہے،

احادیث نبوی صلعم کی صحت و استناد پر آج کل جو شکوک و شبہات کئے جاتے ہین، اس کے جواب مین معارف مین کئی مضمون نکل چکے ہین، مولانا کا یہ مضمون تحقیق و افادہ کے اعتبار سے اس سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے، اس لئے مولانا کی اجازت سے ناظرین معارف کیلئے جو اس سلسلہ کے اور مضامین پڑھ چکے ہین اسکو مجموعۂ تحقیقات علمیہ جامعہ عثمانیہ سے نقل کیا جاتا ہے،

"الحمد للّٰہ وکفیٰ والصلوٰۃ والسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ"

علم حدیث پر بحث کرنے کے لئے ہمین اپنے سامنے ان چند سوالات کو رکھ لینا چاہئے،

(۱) حدیث کی حقیقت کیا ہے؟

(۲) اس علم کی تدوین کب، کس طریقہ سے کس زمانہ مین شروع ہوئی، اور ان طریقون کا اس علم کے وثوق و اعتماد پر کیا اثر مرتب ہوا یا ہو سکتا ہے؟

(۳) ابتدا سے اس وقت تک اس فن کی ممتاز خدمتیں جن بزرگون نے انجام دین خود ان کی اور ان کے کارنامون کی تفصیل،

(۴) اس فن کے متعلق کیا جدید تکمیلی کوششون کی ضرورت باقی ہے،

(۵) حدیث کے بعد فنِ حدیث کے دوسرے متعلقات یعنی فن اسماء الرجال اور اصول حدیث کی حقیقت ان کی تاریخ، موجودہ حیثیت ان مین آیندہ ترقیون کے امکانات،

حدیث کی حقیقت

سب سے پہلے میں پہلے سوال کو لیتا ہون، یعنی حدیث کی حقیقت کیا ہے؟ بات یہ ہو کہ عموماً دنیا میں دو طرح کی قومین پائی جاتی ہین، بعض بلکہ شاید زیادہ تر قومین ایسی ہین جنھون نے اپنے حال کو ماضی سے وابستہ رکھنے کی کوشش نہین کی، اگرچہ واقعہ تو یہی ہے، کہ کسی قوم کا کوئی حال ماضی سے الگ ہو کر تعمیر پذیر نہیں ہو سکتا، لیکن باوجود اس واقعہ کے جیسے جیسے وہ آیندہ کی طرف بڑھتی رہین، اپنے ماضی کو بھلاتی چلی آئیں، ان کے پاس اپنے موجودہ حالات پر غور و فکر کرنے کے لئے گذشتہ حالات و واقعات تجربات و مشاہدات کا کوئی سرمایہ نہین ہے، گویا جس طرح جنگل کی زندگی گذاری جاتی ہے، یہ بھی گذارتے ہین، آخر ریچھوں اور بندرون کو کیا معلوم کہ ان کے جدِ اعلیٰ کون تھے، کن کن جنگلوں اور وادیون پہاڑون سے چھلانگین مارتے ہوئے ان کے آبا و اجداد موجودہ مقام تک پہونچے، کن کن حالات سے ان کو دوچار ہونا پڑا،

لیکن ان کے مقابلہ مین انسانون ہی کا ایک طبقہ ان قومون کا بھی ہے جنھون نے حتی الوسع اس کی کوشش کی ہے، کہ جہان تک ممکن ہو حال کی تعمیر مین ماضی کے تجربات و واقعات سے نفع اٹھایا جائے، اور اس کے لئے ان کو ضرورت محسوس ہوئی، کہ گذرے ہوئے واقعات کو کسی نہ کسی طرح محفوظ کر لیا جائے، انسانیت کے اس گروہ کی اسی کوشش کا نام "تاریخ" ہے، ابتدا مین تاریخ کی حفاظت و بقا کا شوق قومون مین کم رہا ہے، لیکن اب تو یہ ایک ایسی ناگزیر ضرورت بن گئی ہی،

کہ اپنی توانائیون کا ایک بڑا حصہ ہر قوم اس پر خرچ کر رہی ہی، جس سے ہم اور آپ سب واقف ہین جنگل کی زندگی بسر کرنے والے بھی اب اپنے اجداد و اسلاف کے کارنامون کی جستجو گڑی ہوئی ہڈیوں اور پرانے مقبرون اور مرگھٹون مین کر رہے ہین، کونہ کونہ سے قدیم سکّے برآمد کئے جا رہے ہیں، کہنہ قبرون کی کتابون کے حروف کے پڑھنے کی کوشش کیجا رہی ہے، پرانے کھنڈرون کی ایک ایک ٹھیکری چنی جا رہی ہے، ان ہی پر واقعی کچے، یا خیالی بلند و بالا عمارتین تعمیر ہو رہی ہین، گویا اس علم کی ناگزیر ضرورت کو دنیا کی اکثر قومون نے اب تسلیم کر لیا ہے، اور بجز چند ارتیابی الطبع تنگی مزاج خشک دماغ فلسفیون کے عام دنیا کا شدید رجحان بھی ان چیزون کے جاننے کی طرف ہے،

تاریخ اور فنِ حدیث

دنیا کی اسی تاریخ کے ایک عظیم الشان، حیرت انگیز انقلابی حصہ کا نام سچ پوچھئے تو حدیث ہے، میرا مطلب یہ ہے کہ جن انقلابات و حوادث سے گذر کر نسل انسانی موجودہ حالت تک پہونچی ہے، ان مین ایک ایسا واقعہ جس نے کسی خاص شعبۂ حیات ہی مین نہیں، بلکہ مذہبی، سیاسی، معاشرتی، اخلاقی تمام شعبون مین انسانیت کا رخ پلٹ دیا، جس سے زمین کا کوئی خاص حصہ نہیں، بلکہ بلا مبالغہ مشرق و مغرب دونون متاثر ہوئے، ہو رہے ہین، اور ہوتے رہین گے، ماضی کے اسی مدہش حیرت انگیز واقعہ کی تاریخ یا تفصیلی بیان کا نام حدیث ہے، اگرچہ عام طور پر مسلمانون کی ابتدائی تاریخ سے حدیث کا تعلق قرار دیا جاتا ہے، لیکن جہان تک واقعات و حالات کا تعلق ہے، مین "حدیث" کو "انسانیت" کی تاریخ کا ایک حصہ اور ایسا حصہ قرار دیتا ہون، جس کی صرف یہی خصوصیت نہین ہے، کہ ایک بے نظیر عدیم المثال عالمگیر انقلابی عہد سے اس کا تعلق ہے، بلکہ سچ پوچھئے تو آج جس کسی کے پاس یا جس قوم و امت کے ہاتھ مین ماضی بلکہ حال کی تاریخ کا بھی جو حصہ ہے، وہ وثوق و اعتماد مین تاریخ کے اس "محفوظ حصہ" یعنی حدیث کا مقابلہ نہیں کر سکتا، جیسا کہ مین عرض کر چکا ہون کہ مین ان آزردہ فطرت شکیون مین نہین ہون، جو تاریخ کو

جھوٹ کا جنگل قرار دیکر ماضی کا انکار کرتے ہین اور جو کچھ محسوس ہو رہا ہے یہ نہین محسوس ہو رہا ہے اس سوفسطائی نظریہ پر زور دے کر حال کے وجود کو بھی شک کے دانتون سے چبا کر ختم کرنا چاہتے ہین، بلکہ تاریخ کے مقررہ معیار پر ماضی کے جن واقعات کی اب تصحیح ہو چکی ہے، ان کی قدر کرتا ہون، اور سمجھتا ہون کہ آیندہ کی راہ درست کرنے کیلئے ہمین ہمیشہ ماضی کی روشنی سے نفع اٹھانا چاہئے،

فاقصص القصص لعلھم　　لوگون سے پچھلے قصے بیان کرو تاکہ وہ

یتفکرون،　　سوچین،　　(قرآن مجید)

لیکن اگر یہ صحیح ہے جیسا کہ ایک بڑے مشہور مسلم الثبوت مورخ کا بیان ہے "کسی زمانہ کے حالات ...... جب قلمبند کئے جاتے ہین، تو یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے، کہ ہر قسم کی بازاری افواہین قلمبند کر لیجاتی ہین جن کے راویون کا نام و نشان تک معلوم نہیں ہوتا، ان افواہون سے وہ واقعات انتخاب کر لئے جاتے ہین، جو قرائن و قیاسات کے مطابق ہوتے ہین تھوڑے زمانہ کے بعد (یعنی کتابی شکل اختیار کرنے کے بعد) یہی ایک دلچسپ تاریخی کتاب بن جاتی ہے، یورپ کی اکثر تصنیفین اسی اصول پر لکھی گئی ہین، اور اس وقت ہمارے پاس ماضی کی تاریخون کا جو ذخیرہ ہے خواہ وہ روم ہو یا یونان، چین ہو یا ایران، ان قدیم اقوام کی تاریخ جن ذرائع سے مرتب ہوئی ہے، اگر ان کے اساسی سرچشمون کی جانچ کی جائے گی تو جو کچھ اس فاضل مورخ نے بیان کیا ہے، بہت کچھ اس کی توثیق کرنی پڑے گی، مشکل ہی سے انسانون کے پاس اس وقت کوئی ایسی تاریخی یادداشت مل سکتی ہے، جسے واقعہ کے عینی شاہدون نے خود مرتب کیا ہو، یا ان کے براہ راست بیانون کو خود انہی سے سن کر کتابون مین درج کیا گیا ہو، اتفاقاً اگر کوئی ایسی چیز مل بھی جائے، تو اس کا پتہ چلانا قطعی دشوار بلکہ شاید ناممکن ہے، کہ ضبط و اتقان سیرت و کیرکٹر کے لحاظ سے ان کا کیا درجہ تھا، معتبر سے معتبر ترین کسی تاریخی ذخیرہ کے وثوق کے متعلق اگر کوئی بات پیش کیجا سکتی ہے، تو یہی ہے کہ

جس زمانہ مین واقعہ گذرا ہے مورخ خود بھی اس زمانہ مین موجود تھا، اتفاق سے کسی واقعہ کے متعلق اگر ایسی شہادت میسر آجاتی ہے تو تاریخ کا یہ حصہ زرین شاہکارون مین شریک کر دیا جاتا ہے؛ لیکن خود اس معاصرت کا یہ حال ہے، کہ قدیم ماضی کے تاریک زمانہ کو تو جانے دیجئے، آج جب کہ جدید صناعات و ایجادات نے زمین کی طنابین کھینچ کر ایک ملک کو دوسرے ملک سے ملا دیا ہے، تعلیم عام ہو چکی ہے، کم از کم یورپ کے مکتبون اور اسکولون مین روے زمین کے اطلسون کا مطالعہ ہر ایک کو کرا دیا جاتا ہے، لیکن ایک واقعہ نہیں آئے دن ایسی ایسی جہالتون اور غلط فہمیون کے شکار غریب جاہل مشرقی ہی نہیں، بلکہ فرزانہ و دانا فرنگ کے ارباب خبر و علم ہوتے رہتے ہین کہ بعض دفعہ آدمی کو حیرت ہو جاتی ہے، اور تاریخ جھوٹ کا جنگل ہے، دماغ سوچنے لگتا ہے، کہ کیا اس دعویٰ مین کچھ واقعہ کا عنصر بھی شریک ہے، ؟ بہت پرانے زمانہ کی بات نہیں ہے کہ ۱۹۰۵ء مین کانگڑہ (پنجاب)، کا مشہور زلزلہ ہندوستان مین آیا تھا، ایک نہین، بلکہ متعدد انگریزی اخبارون مین اس زلزلہ کے متعلق یہ خبر شائع ہوئی تھی، "کہ کانگڑہ جو بمبئی کے قریب ایک جزیرہ ہے، وہان ایک سخت زلزلہ آیا" اور بیچارے اخبار والے تو شہر خبرون کی جماعت ہے، عام طور پر گپ نویسی مین یہ بدنام ہے، لیکن مشہور ریفرنس بک ہنٹر کی انیوبل جو مشہور کتاب ہے، اور ہر قسم کے حوائج کے لئے ایک مستند کتاب سمجھی جاتی ہے، اوس مین اسی زلزلے کے متعلق یہ عبارت اس وقت تک موجود ہے :-

"ایک سخت زلزلے نے ایک وسیع ضلع مین جو آگرہ اور شملہ کے درمیان واقع ہے عام تباہی اور سخت نقصان برپا کیا"

نقصان کی تفصیل بتاتے ہوئے صرف اسی مورخ نے نہین بلکہ دوسرون نے بھی یہ ارقام فرمایا ہے :

اس سے کئی سو آدمی ہلاک ہوئے

حالانکہ پنجاب گورنمنٹ کی رپورٹ کے مطابق اس زلزلہ مین بیس ہزار سے کم آدمی ہلاک نہین ہوئے تھے، معاصر مورخین کی کتابون مین اگر اس قسم کی ظرفگیون اور بوالعجبیون کو تلاش کیا جائے تو ایک اچھی خاصی کتاب تیار ہو سکتی ہے، سیاحون کی یادداشتون کو بھی تاریخی وقائع کے ثبوت مین بہت اہمیت دیجاتی ہے، اور اس سے بے پروا ہو کر دیجاتی ہے، کہ خود اس سیاح کا اپنے ذاتی رجحانات سمجھ بوجھ سچائی راستبازی مین کیا حال تھا، لیکن ان سیاحون کی بدولت واقعات کی صورت کبھی کبھی کتنی مسخ ہو جاتی ہے، اس کا ایک سرسری اندازہ ہمارے موجودہ میر شعبۂ دینیات (نواب ناظر یار جنگ جسٹس حیدرآباد ہائی کورٹ) کے ڈرائنگ روم کی ایک تصویر سے ہو سکتا ہے، جو انگلستان کے ایک معتبر اخبار سے الگ کر کے محفوظ کی گئی ہے، یہ ہندوستان کے ایک موقع کی تصویر ہے، اور اس کے نیچے جلی حروف میں یہ لکھا ہوا ہے، کہ بودھ مذہب کے لوگ اپنی ایک مشہور مذہبی رسم جو آدیا کے نام سے موسوم ہے، ادا کر رہے ہیں، مین نے اس تصویر کے نیچے جب اس فقرہ کو پڑھا، تو بار بار حیرت ہوتی تھی، کہ آخر یہ کیا ہے، تصویر سے صاف معلوم ہو رہا تھا، کہ ہندوستانی مسلمانون کی ایک جماعت نماز پڑھ رہی ہے، ان کی شکل وصورت، لباس، وضع قطع، طریقہ نشست ہر چیز ہندی مسلمانون کی تھی، لیکن معتبر سیاح نے جس وقت یہ فوٹو لیا تھا، اس کے نیچے اوس نے یہی عبارت درج کی تھی، آخر جب میر شعبہ صاحب باہر تشریف لائے، ان سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ آپ نے قصداً اس تصویر کو اسی لئے محفوظ کیا ہے، تاکہ یوروپین سیاحون کی تاریخی شہادت کی ایک گواہی مہیا ہو، آپ نے فرمایا کہ یہ دہلی مین نماز عید کے موقع کی تصویر ہے، ایک مغربی سیاح نے اس عید کو آدیا بنایا، اور آدیا کو خدا جانے کس طرح اوس نے بودھ مذہب والون کی رسم قرار دیکر اخبار مین اپنے جدید انکشاف کا اعلان کیا،

ان چند تشکیکی مثالون کو پیش کرنے سے میری یہ غرض نہیں ہے کہ واقعی مین دنیا کے موجودہ

تاریخی ذخیرون کو بالکلیہ غیر معتبر اور ناقابل لحاظ قرار دینا چاہتا ہون، بلکہ مقصد صرف اس قدر ہے کہ ان احتمالات وشکوک کی کمزوریون کے باوجود بھی آج جب علمی دنیا مین فن تاریخ ہر قسم کے احترام واعزاز کا مستحق ہے تو "حدیث" جو صرف مسلمانون ہی کی تاریخ نہین ہے، بلکہ جیسا کہ مین نے عرض کیا تمام دنیا کی انسانیت کے ایک عظیم انقلابی عہد آفرین کا ایک ایسا مکمل تاریخی مرقع ہے، جسے ٹھیک حقیقی اور اصلی شکل وصورت بلکہ ہر خط وخال کی حفاظت مین لاکھون ہی نہیں بلکہ کروڑون انسانون کی وہ ساری کوششیں اور تدبیرین صرف ہوئی ہین جو کسی واقعہ کی حفاظت کے متعلق آدمی کا دماغ سوچ سکتا ہے، بلکہ اس کی حفاظت وصیانت مین بعض ایسے قدرتی عوامل نے بھی کام کیا ہے جیسا کہ ابھی آپ کو معلوم ہوگا، جو دنیا کے کسی تاریخی واقعہ کو نہ اس وقت تک میسر آئے، اور نہ آیندہ آسکتے ہین،

لیکن قبل اس کے کہ مین کچھ اور کہون اس پر بھی تنبہ کر دینا چاہتا ہون کہ حدیث جس کے متعلق نہ جاننے والون کا تو صرف یہ خیال ہے، کہ وہ دینیاتی طرز کی کوئی چیز ہو اور دینیات کے لفظ کے ساتھ ہی ان کا دماغ فوراً دور وحشت کے ان قدیم خرافات کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، جسے بدقسمتی سے اس زمانہ مین مذہب یا مذہب کی ایک قسم خیال کیا جاتا ہے، گویا دینیات کے معنی چند وہمی رسوم وعادات یا چند رٹے ہوئے الفاظ منتر جنتر جادو ٹوٹکے وغیرہ کے ہین جن مین صحرائی باشندے کسی زمانہ مین کیا اب تک مبتلا ہین، مذہب کے متعلق جن کے دماغون مین اس قسم کے خیالات ہین، حدیث جو مسلمانون کے مذہبی علوم کا ایک جز ہے، اس کے متعلق میرے ان دعوون کو سن کر ممکن ہے کہ حیرت ہو اور ان کی حیرت تو چندان محل تعجب نہین اسلئے کہ بےچارے ان مسکینون کے لئے بڑا عذر ہے،

حدیث کی مدرسی تعریف لیکن جاننے والون کو بھی شاید شبہہ ہوتا ہوگا، کہ مدرسہ مین جس فن

کی یہ تعریف کیجاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (یعنی مسلمانوں کے پیشوا) کے اقوال وافعال اور ایسے واقعات جو ان کے سامنے پیش آئے لیکن ان مین کوئی تبدیلی نہین کی گئی، جسے اصطلاحاً تقریر کہتے ہین، غرض پیغمبر کے اقوال وافعال وتقریر کا نام حدیث ہے، بعضون نے اس کو آگے بڑھا کر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ اور بعضون نے صحابہ کے شاگردون یعنی تابعین کے اقوال وافعال کو بھی اس فن کے ذیل مین شریک کر لیا ہے،

کہان حدیث کی یہ درسی اور مذہبی تعبیر، اور کہان میرا یہ دعویٰ کہ حدیث مسلمانون ہی کی نہیں، بلکہ انسانیت کے اہم ترین انقلابی عہد کی تاریخ کا معتبر ترین ذخیرہ ہے، ان دونون مین کیا نسبت ہے، شاید یہ خیال کیا جاتا ہو کہ زمانہ کے حالات سے متاثر ہو کر مین نے اپنی تعبیر بدلی ہے لیکن یہ واقعہ نہیں ہے، اس مین کوئی شبہہ نہین کہ ہر چیز کے سمجھانے کے لئے اسی زبان مین گفتگو کیجاتی ہے، جسے مخاطب سمجھ سکتے ہون، مجھے اس سے انکار نہین ہے کہ مین نے اس فن کی تعریف کرتے ہوئے کچھ الفاظ ضرور بدلے ہین لیکن الفاظ کے بدلنے سے واقعات نہین بدلتے، جو نہیں جانتے ہیں انھیں تو آیندہ بتایا جائے گا، لیکن جو جانتے ہین کہ حدیث کا تعلق جس ذاتِ گرامی (صلی اللہ علیہ وسلم) سے ہے کیا وہ اس کا انکار کر سکتے ہین، کہ جن الفاظ مین اس فن کی مین نے تعبیر پیش کی ہے، کیا یہی اصل واقعہ نہیں ہے، اسلامی تحریک نے اپنے زمانہ آغاز سے اس وقت تک مشرق ومغرب کے باشندون کے مذہبی سیاسی معاشرتی اخلاقی پہلوؤن کے انقلاب مین جو کام کیا ہے، اور کر رہی ہے، ان کو پیشِ نظر رکھنے کے بعد مسلمان ہی نہیں کوئی نامسلمان بھی حدیث کی اس تاریخی تعبیر کا انکار کر سکتا ہے، جسے مین نے پیش کیا ہے، ماسوا اس کے سچ یہ ہے کہ بالکلیہ یہ میری تعبیر ہے بھی نہیں، فنِ حدیث کے سب سے بڑے امام امام الائمۃ حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب کا جو نام رکھا ہے، اگر اسی پر غور کر لیا جائے تو بآسانی سمجھا جا سکتا ہے، کہ مین نے جو کچھ کہا ہے، یہ کوئی نئی بات نہیں ہے،

بلکہ سمجھنے والون نے ہمیشہ اس فن کو اسی نگاہ سے دیکھا ہے، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب آج تو صرف بخاری شریف کے نام سے مشہور ہے لیکن یہ اس کتاب کا اصلی نام نہیں ہے، بلکہ خود حضرت امام رح نے اپنی کتاب کا نام،

الجامع الصحیح المسند المختصر من امور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وایامہ

رکھا ہے، اس مین "امور" اور "ایام" کے الفاظ قابلِ غور ہین، جن سے صاف معلوم ہوتا ہے، کہ حدیث کی صحیح تعریف امام بخاری کے نزدیک ان تمام امور کو حاوی ہے جن کا کسی نہ کسی حیثیت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق ہو، آگے ایام کے الفاظ نے تو اس کی تعریف کو اور بھی وسیع کر دیا یعنی وہی بات جو مین نے عرض کی تھی، کہ فنِ حدیث دراصل اس عہد اور ایام کی تاریخ کی تعبیر ہے، جس مین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جیسی ہمہ گیر عالم پر اثر انداز ہونے والی ہستی انسانیت کو قدرت کی جانب سے عطا ہوئی، بہرکیف اگر اصطلاحی جھگڑون سے الگ ہو کر پھل سے درخت کے پہچاننے کے اصول کو مدنظر رکھا جائے، تو حدیث کے موجودہ ذخیرہ پر سرسری نظر ڈالنے کے بعد بھی ایک معمولی آدمی اس کا اندازہ کر سکتا ہے، کہ حدیث کی صحیح حقیقت اور اس کی واقعی تعریف وہی ہو سکتی ہے جس کی طرف حضرت امام بخاری نے اپنی کتاب کے نام مین اشارہ فرمایا ہے، اور مین نے جس کی تشریح کی ہے،

غالباً حدیث کی حقیقت یا تعریف کے لئے میرا یہ مختصر بیان کافی ہو سکتا ہے، درسی کتابون مین جیسا کہ ہر تعریف کے قیود و شرائط پر بحث کر کے بات کو بتنگڑ بنانے کی کوشش کی جاتی ہے، مین ان دور از کار لفظی گورکھ دھندون مین آپ لوگون کو الجھا کر وقت نہیں ضائع کرنا چاہتا، اسلئے اس بحث کو اسی نقطہ پر ختم کر کے اب مین دوسرے ضروری سوالات کی طرف متوجہ ہوتا ہون، ہمارے سامنے دوسرا سوال یہ تھا کہ تاریخ کے اس حصہ کی تدوین کس طرح اور کس زمانہ مین،

عمل مین آئی، اسی سوال کے جواب مین آپکے سامنے وہ امتیازات اور خصوصیات بھی آجاَین گے جو
تاریخ کے اس حصہ کو دنیا کے دوسرے تاریخی ذخیرون سے ممتاز کرتے ہین،

اس تاریخ کے ابتدائی مورخین ورواۃ کے خصوصیات

اتنا تو کم از کم ہر لکھا پڑھا آدمی جانتا ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی
پاک، یا بالفاظ امام بخاری "امور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وایامہ"
کے پہلے رواۃ یا ابتدائی مورخین وہی حضرات ہین، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے شرف صحبت سے
فیضیاب تھے یعنی صحابہ کرام لیکن ان بزرگون نے تاریخ کے اس حصہ کی روایت کیا انہی
اسباب کے تحت کی جن کے زیر اثر دنیا کی دوسری تاریخین مدون ہوئی ہین؟

میرا مقصد یہ ہے کہ دنیا کے عام تاریخی سرمایون کی تدوین مین جس طرح عموماً حال کو ماضی سے
مربوط رکھنے کا جذبہ یا پچھلون کی مجلسون کو پہلون کی داستانون سے گرم رکھنے کا ذوق کارفرما رہا ہے،
کیا حدیث کی تدوین بھی اسی جذبہ کے تحت ہوئی؟ میرا خیال ہے کہ حدیث کی تدوین کی بحث چھیڑنے
سے پہلے سخت ضرورت تھی، کہ پہلے ان اسباب یا جیسا کہ مین نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے، کہ ان
قدرتی عوامل کو سامنے لانے کی حاجت ہے، جو دنیا کی عام تاریخ سے اس خاص حصہ یعنی حدیث
کو بالکل جدا کر دیتے ہین، ممکن ہے کہ اس بحث مین آپ کا کچھ زیادہ وقت مین لون، لیکن بات
چونکہ بالکل نئی ہے، اس لئے اجمال سے کام لینے مین اندیشہ ہے کہ مین جو کچھ کہنا چاہتا ہون، وہ
شاید پورے طور سے ذہن نشین نہ ہوسکے، مین ان امتیازی اسباب وعوامل کو الگ کرکے
بیان کرتا ہون،

عام تاریخی ذخیروں سے حدیث کے امتیازات

(۱)

عام تاریخون سے تاریخ کے اس حصہ کو جو پہلا امتیاز حاصل ہے، وہ اس امر کی بساطت ہے

جس سے اس کا تعلق ہے یعنی یہ کہنا چاہتا ہون کہ ہمارے پاس اس وقت تاریخ کے جو عام
ذخیرے ہین، عموماً ان کا تعلق کسی قوم کی حکومت، کسی عظیم الشان جنگ، الغرض اسی قسم کی منتشر،
پراگندہ گوناگون چیزون سے ہے جن کا احاطہ آسان نہیں ہے، بخلاف اس کے حدیث اس تاریخ
کا نام ہے جس کا تعلق براہ راست ایک خاص شخصی وجود یعنی سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی
کی ذات اقدس سے ہے، ایک قوم، ایک ملک، ایک حکومت، ایک جنگ کے تمام اطراف وجوانب
کو صحیح طور پر سمیٹ کر بیان کرنا ایک طرف ہے، اور دوسری طرف ملک نہین، ملک کی کوئی خاص
قوم نہین، کسی قوم کا کوئی قبیلہ نہیں، کسی قبیلہ کا کوئی خانوادہ نہین، بلکہ صرف ایک احد بسیط
شخص کی زندگی کے واقعات کا بیان کرنا ہے، خود اندازہ کیجئے کہ احاطہ وتدوین کے اعتبار
سے دونون کی آسانی ودشواری مین کوئی نسبت ہے، پہلی صورت مین کوتاہیون، غلط فہمیون،
غلطیون کے جتنے قوی اندیشے ہین، یقیناً اسی نسبت سے دوسری صورت مین صحت و واقعیت
کی اسی قدر عقلاً توقع کیجا سکتی ہے،

(۲)

دوسرا امتیاز جو پہلے امتیاز سے بہت زیادہ اہم ہے، وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
اور ان کے مورخون یعنی صحابہ کرام کا باہمی تعلق ہے، بلاشبہ اس وقت ہمارے سامنے مختلف اقوام
وممالک، سلاطین اور حکومتون کی تاریخین ہین، لیکن جن مورخون کے ذریعہ سے یہ تاریخین ہم تک
پہونچی ہین، کیا ان مین کسی تاریخ کا اپنے مورخ یا مورخین سے وہ تعلق تھا، جو حضور صلی اللہ علیہ
وسلم کو صحابہ کرام کے ساتھ تھا؟ سب سے پہلی بات تو یہی ہے کہ مشکل ہی سے آج کوئی ایسا
تاریخی حصہ ہمارے پاس نکل سکتا ہے، جس کے مورخین خود ان واقعات کے عینی شاہد
ہون، بلکہ جیسا کہ پہلے بھی مین نے ذکر کیا ہے، کہ عموماً ان تاریخون کی تدوین یون ہی ہوئی ہے

کہ ابتدا مین مبہم مجہول الحال افواہون کی صورت مین واقعات اِدھراُدھر بکھرے رہے، پھر ان مین سے جب کسی کو شوق ہوا تو اوس نے ان ہی افواہون کو قلمبند کرنا شروع کیا، پھر خود اس مورخ ہی نے یا اوس کے بعد والون نے قرائن وقیاسات سے جہان تک ممکن ہوا جس حصہ کو چاہا باقی رکھا، جسے چاہا قلم زد کر دیا، یہ تو شروع مین ہوا، بعد کو جون جون ان قلم بند شدہ واقعات پر زمانہ گذرتا گیا، اوراق مین زیادہ بوسیدگی پیدا ہوئی، کیڑون کی خوراک سے بچکر جو حصہ باقی رہا، پچھلی نسلون کے لئے وہی تاریخی وثیقہ بن گیا، آج اسی ذہنیت کا نتیجہ ہے، کہ مطبوعہ کتابون سے زیادہ بھروسہ قلمی کتابون پر اور قلمی کتابون مین بھی سب سے زیادہ قیمتی وہ مسودات ہین جو بوسیدہ اور کرم خوردہ ہو چکے ہین، اور سنگی، برنجی یا آہنی تختیون کا کوئی ذخیرہ اگر کسی مورخ کو مل گیا تو وہی چیز جو ہمارے ہی جیسے انسانون نے کسی زمانہ مین لکھ کر زمین مین گاڑ دی تھی،......

......بلکہ ہم تو اپنے معاصرین کو ایک حد تک جانتے بھی ہین، لیکن ان کے لکھنے والون کا تو کچھ پتہ نہین ہوتا، لیکن کیا کیجئے کہ باین ہمہ وہ معصوم فرشتون کے بیان کی حیثیت اختیار کر لیتے ہین،

ا؎ بلکہ اگر بعض ثقہ راویون کا یہ بیان صحیح ہے، کہ ہندوستان کی بعض قومون کے علمی مرکزون مین قدیم ہند کے لئے تاریخی مواد فراہم کرنے کی ایک صورت یہ بھی نکالی گئی ہے، کہ آہنی اور برنجی پترون یا تختیون پر پرانی زبانون پرانے حروف مین اپنے مطلب کے موافق عبارتین کندہ کر لیجاتی ہین، اور کسی مشہور آثاری کھنڈر مین انہی کو دفن کر دیا جاتا ہے، پھر کچھ دنون کے بعد انہی کو نکال کر علمی ذخیرہ مین جدید اکتشاف کی حیثیت سے انکا اور ان سے جو نتائج نکلتے ہین، اضافہ کر دیا جاتا ہے، اگر یہ واقعہ صحیح ہے تو علم پر جاہلون کا یہ کتنا بڑا ظلم ہے، اور اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے، کہ ہم جن قدیم کتبون پر اندھا دھند ایمان لا رہے ہین ان میں بھی اشتباہ کی کس حد تک گنجایش ہے، بلکہ سکندر کی لانبی مدفونہ زرہون کا افسانہ اگر صحیح ہے تو صرف کتابی ہی نہین، بلکہ ان کھنڈرون سے جو چیزین نکل رہی ہین، اور ان سے جو نتائج نکالے جا رہے ہین، محلِ غور و فکر بن جاتے ہین، ۱۲،

لیکن اسی کے ساتھ مجھے اس کا بھی اعتراف کرنا چاہئے، کہ گذشتہ بالا کلیہ سے تاریخ کے بعض مستثنیٰ بھی ہین خصوصًا اسلامی دور مین مسلمان بادشاہون کے حکم سے جب تاریخون کی تدوین کا سلسلہ شروع ہوا، اور باضابطہ شاہی وسائل و ذرائع کے ذریعہ سے مورخون کو واقعات کے فراہم کرنے مین امداد دی گئی، یقینًا ان کتابون کی نوعیت قدیم تاریخون سے بالکل جداگانہ ہے، اسی طرح مسلمان مورخون کی بنائی ہوئی راہون پر اس زمانہ مین خصوصًا مغربی قومین نسبتہ زیادہ حزم واحتیاط سے کام لے رہی ہین، لیکن کچھ بھی ہو کسی زمانہ کی تاریخ ہو، ان کے مورخون کو ان واقعات سے یا صاحبِ واقعات سے قطعًا وہ تعلق نہ تھا، اور نہ ہو سکتا ہے، جو صحابہ کرام کو ذاتِ قدسی صفات سے تھا، یہی نہیں کہ ان بزرگون نے حضورؐ کے ہاتھ پر ایمان و اسلام کی بیعت کی تھی، آپ کی نبوت پر وہ ایمان لائے تھے، آپؐ سے ان کو وہ تعلق تھا جو ایک امتی کو اپنے پیغمبر سے ہونا چاہئے، بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر جیسا کہ واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے مان باپ، بیوی بچون، بلکہ اپنی جانون سے بھی زیادہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی زندگی کو عزیز رکھتے تھے، وہ سب کچھ حضورؐ پر قربان کرنے کے لئے تیار تھے، گویا ایک قسم کے عشق و سرمستی کے نشہ مین مخمور تھے، یقینًا یہ ایسا امتیاز ہے جو کسی تاریخی واقعہ کو اپنے مورخین کے ساتھ حاصل نہین، آخر دنیا کی ایسی کونسی تاریخ ہے جس کے بیان کرنے والے مورخین اس تاریخ سے ایسا والہانہ تعلق رکھتے ہون کہ بیان کرتے جاتے ہین، اور روتے جاتے ہین، کانپتے جاتے ہین، عبد اللہ بن مسعود کے متعلق ان کے دیکھنے والون کا بیان ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرکے بہت کم حدیثین بیان کرتے تھے لیکن اگر کبھی زبان پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام آگیا راوی کا بیان ہے کہ اس کے بعد ارتعد وارتعدت ثیابہ تنفخ اوداجہ مغرورقۃ عیناہ، (کانپنے لگتے اور ان کے کپڑون مین تھرتھری پیدا ہو جاتی، گردن کی رگین پھول جاتی تھین، آنکھین

آنسوؤن سے بھر جاتین، (مستدرک حاکم) ایک عبد اللہ بن مسعودؓ ہی نہین، بلکہ ان اصحاب کی ایک فہرست تیار ہو سکتی ہے جن پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر مبارک کے وقت ایک خاص قسم کی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی، حضرت ابوذرؓ کبھی کبھی کوئی حدیث بیان کرنا چاہتے، مگر منہ سے اوصانی حبی ابوالقاسم اوصانی خلیلی صلی اللہ علیہ وسلم، الفاظ نکلتے اور چیخ مار کر بیہوش ہو جاتے تھے، اسی قسم کے واقعات حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالی عنہ کے ذکر مین بھی ملتے ہین، اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جس تاریخ کو اسکے مورخون مین محبوبیت کا یہ مقام عالی حاصل ہو، قدرتی طور پر ان کے دل و دماغ، ان کے حافظے اس سے کس حد تک متاثر ہو سکتے ہین،

(۳)

تیسری خصوصیت اس تاریخ اور اس کے راویون کی یہ ہے، کہ علاوہ مذکورۂ بالا تعلقات کے ان براہ راست مورخون یا چشم دید راویون اور گواہون نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک پر بیعت ہی اس بات پر کی تھی، کہ تاریخ کے اس عجیب و غریب واقعہ کے ہر ہر جزء ایک ایک خط و خال کے زندہ نقوش اپنے اندر پیدا کرین گے، انھون نے جس قرآن کو خدا کی سرّبعت اور قدرت کا قانون یقین کر کے مانا تھا، اس مین بار بار مطالبہ کیا گیا تھا کہ تم مین ہر ایک کی زندگی کا نصب العین صرف یہی ہونا چاہئے کہ جو کچھ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہین، انھین سنو سنکر یاد رکھو اور ان پر ایمان لاؤ، یقین کرو، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ کرتے ہین اسکی ہر ہر ادا پر نگاہ رکھو اور ٹھیک ٹھیک اسی طرح جسطرح انکو جو کچھ کرتے ہوئے دیکھتے ہو، تم بھی اس کام کو اسی طرح انجام دینے کی کوشش کرو،

(۱) ما آتاکم الرسول فخذوہ وما نہاکم عنہ فانتہوا

رسول نے جو کچھ تمھیں دیا ہے، اُسے پکڑے رہے ہو اور جس سے انھون نے روکا ہے اس سے رُک جاؤ،

(۲) وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ،

ہم نے کوئی رسول نہین بھیجا، لیکن صرف اسی لئے کہ اس کی پیروی اور اطاعت خدا کے حکم سے کیجائے،

(۳) قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ،

کہدو اگر تم اللہ کو چاہتے ہو، تو میری پیروی کرو، اللہ بھی تمھیں چاہنے لگیگا،

(۴) لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ،

تمھارے لئے اللہ کے رسول مین اچھا نمونہ ہے،

سمع و طاعت، اطاعت و اتباع کے ان پُر جلال مطالبون سے قرآن گونج رہا تھا اور ان لوگون کے سامنے گونج رہا تھا، جو ہر چیز سے دست بردار ہو کر صرف اسکی آواز مین گم ہونے کا آخری اور قطعی فیصلہ کر چکے تھے،

ان کا یہ فیصلہ غلط تھا یا صحیح مجھے اس وقت اس سے بحث نہیں لیکن حضرات صحابہ کرام کے اس "فیصلہ" کا علم مسلم اور غیر مسلم ہر طبقہ کو ہے، بتایا جائے کہ دنیا کے کس تاریخی واقعہ سے اسکے مورخین اور راویون کا یہ تعلق ہے، عجیب بات ہو کہ جن بزرگون سے کسی زمانہ مین انسانون کے کسی گروہ کو اگر یہ تعلق پیدا بھی ہوا تھا تو ان کی تاریخ ہی آج ناپید ہے، اور تاریخ کا جو سرمایہ آج ہمارے پاس ہے اس کے مورخون کو ان تعلقات کی ہوا بھی نہ لگی تھی،

کہان پچھلون کی مجلسوں کی گرم بازاری کے لئے مورخین کے بیانات اور کہان ان سوختہ سامانون کی تاریخی شہادتین،

(۴)

اسی کے ساتھ ہمین اس کا بھی اضافہ کرنا چاہئے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوالُ

اعمال کی اطاعت و اتباع ہی ان بزرگون کے لئے ضروری نہ تھی، بلکہ جس قرآن اور جس فرمان نے ان پر یہ فریضہ عائد کیا تھا، اسی نے ان کو اس کا بھی ذمہ دار بنایا تھا، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو کچھ کہتے ہوئے انھون نے سُنا ہے، اور جو کچھ کرتے ہوئے انھون نے دیکھا ہے، وہ دوسرون تک مسلسل پہونچاتے چلے جائین، ہر حاضر غائب کو، اور ہر پہلا پچھلون کو ان کی طرف بلاتا جائے، قرآنی آیتون

(۱) کُنتم خیر امةٍ اخرجت للناس تأمرُون بالمعروف وتنھون عنِ المنکر،

تم ایک بہترین امت ہو، انسانون کی (بھی خواہی) کے لئے تم ظاہر کئے گئے ہو، تاکہ اچھی باتون کا لوگوں کو حکم دو، اور بُری باتون سے ان کو روکو،

(۲) ولتکن منکم اُمة یدعون الی الخیر ویأمرُون بالمعروف وینھون عن المنکر،

چاہئے کہ تم مین ایک گروہ ہو، جو نیکی اور بھلائی کی طرف لوگون کو بلائے، اچھی باتون کا حکم دے، اور بُری باتون سے روکے،

ہی کی یہ تفسیر تھی، جو مختلف پیرایون مین صحابۂ کرام کو مخاطب کرکے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرمایا کرتے، مِنیٰ کا میدان ہے، خیف کی مسجد ہے، ایک لاکھ سے اوپر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والون کا مجمع ہے، سب کو مخاطب کرکے فرمایا جاتا ہے،

(۱) نضر اللہ عبداً سمع مقالتی فوعاھا ثم اداھا الی من لم یسمعھا، (صحاح)

ترو تازہ رکھے اللہ اس بندے کو جس نے میری بات سُنی، پھر اسے یاد رکھا، اور جس نے نہیں سنا ہو اس تک اسے پہنچا دیا،

یہی منی کا میدان ہی حجۃ الوداع کے مشہور تاریخی خطبہ مین اعلان فرمایا جاتا ہے،

(۲) ترکت فیکم شیئین لن تضلوا بعدھما کتاب اللہ وسنتی ولن یتفرقا حتی یردا علی الحوض، (صحاح)

مین تم مین دو چیزین چھوڑتا ہون جن کے بعد تم پھر گمراہ نہین ہو سکتے، (ایک تو) اللہ کی کتاب (اور دوسری) میری سنت، یہ دونون باہم ایک دوسرے سے جدا نہ ہون گے، جب تک کہ حوض (کوثر) پر پھر میرے سامنے آجائین،

مجمع سے دریافت فرمانے کے بعد کہ کیا مین نے پہونچا دیا، آسمان کی طرف انگلیان اٹھاکر اَللّٰھُمَّ ھل بلغت اللّٰھم ھل بلغت اللّٰھم ھل بلغت کے ارشاد فرمانے کے بعد آخری رخصت کے اس خطبہ کو اس مشہور متواتر فقرہ پر ختم فرمایا جاتا ہے،

الا فلیبلغ الشاھد الغائب (صحاح)

چاہئے کہ جو حاضر ہے وہ غائب کو پہنچاتا جائے،

جس دردناک اور اثر انگیز ماحول مین اس خاتمہ کا اعلان ہوا ہے، اندازہ کیا جاسکتا ہے، کہ جن جذبات و ہیجانات سے مخاطب مجمع بھرا ہوا تھا، اس پر کیا اثر ہوا ہوگا، اسی اثر کا آپ کو یقین تھا کہ صحابہ کی جماعت کو خطاب کرکے بطور پیشین گوئی آپ فرماتے:-

تسمعُون ویسمع منکم ویسمع من الذین یسمعون منکم، (ابوداؤد...... مستدرک)

تم مجھ سے سُن رہے ہو، تم سے بھی سُنا جائیگا، اور جن لوگون نے تم سے سنا ہے ان سے بھی لوگ سنین گے

۵ یعنی اے اللہ کیا مین نے پہنچا دیا، کیا مین نے پہونچا دیا کیا مین نے پہنچا دیا تین دفعہ ارشاد فرمایا، ۱۲

نہ صرف عام مجامع مین یہ اعلان کیا جاتا تھا بلکہ ملک کے مختلف اطراف سے وقتاً فوقتاً وفود کے جو سلسلے دربارِ نبوت مین حاضر ہوا کرتے تھے، عموماً ان کو ایسی جگہ ٹھہرایا جاتا تھا جہان سے "اس قوم" کے معائنہ اور مشاہدہ کا ان کو کافی موقع مل سکتا ہو، جس کے وہ مورخ بنائے جاتے تھے، پھر جو کچھ سنانا اور دکھانا مقصود ہوتا وہ سنایا اور دکھایا جاتا تھا، آخر مین رخصت کرتے ہوئے حکم دیا جاتا جیسا کہ بخاری مین ہے،

احفظوهن واخبروهن من ورائکم،	ان باتون کو یاد رکھو، اور جو لوگ تمھارے پیچھے ہین، انھیں ان سے مطلع کرتے رہنا،

حافظ ابن حجر اس فقرہ کی شرح مین لکھتے ہین :-

یشمل من جاؤا من عند هم وهذا باعتبار المکان ویشمل من یحدث لهم من الاولاد وغیرهم وهذا باعتبار الزمان، (فتح الباری)	یہ ان لوگون کو بھی شامل ہے جن کے پاس سے یہ لوگ آئے تھے، اور یہ بات مکان کے لحاظ سے ہے، اور ان آیندہ نسلون کو بھی شامل ہے جو بعد کو پیدا ہونے والی ہین، اور یہ بات زمانہ کے حساب سے ہوگی،

اور یہ تو سب ہی جانتے ہین کہ اسلام کے دائرہ مین جو قبائل داخل ہوتے جاتے تھے، دربارِ رسالت سے ان کی تعلیم و تلقین کے لئے ذمہ دار اصحاب کو بھیجا جاتا تھا، حکم دیا جاتا تھا کہ جو کچھ تم نے ہم سے سیکھا ہے وہ انھین بھی جا کر سکھاؤ، صرف استحبابی احکام ہی نہیں، بلکہ قرآن کی آیت :-

ان الذین یکتمون ما انزلنا من البینات والهدی من بعد ما بیناه للناس فی الکتاب اولئک یلعنهم الله ویلعنهم اللاعنون،	جو لوگ چھپاتے ہین اس چیز کو جسے ہم نے اُتارا ہے، اور جو کھلی باتون اور سوجھ بوجھ (ہدایت) کی باتون پر مشتمل ہے اور اسکے بعد چھپاتے ہین جب انسانون کیلئے کتاب مین ہم نے اُسے بیان کر دیا ہے یہی لوگ ہین جن پر خدا بھی لعنت کرتا ہے اور لعنت کرنے والے بھی لعنت کرتے ہین

کی بنیاد پر صحابہ کرام جس تاریخ کی نشر و اشاعت کے ذمہ دار ٹھہرائے گئے تھے، اس کا چھپانا گناہ خیال کرتے تھے، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث بھی روایت کرتے تھے،

من سئل عن علم ثم کتمه الجم یوم القیامة بلجام من نار، (ابوداؤد و ترمذی)	جو کوئی پوچھا جائے کسی علم کی بات سے اور اُسے وہ چھپائے تو قیامت کے دن آگ کی لگام اُسے پہنائی جائے گی،

اور اسی کا نتیجہ تھا کہ سکرات مین مبتلا ہین، لیکن بعض صحابہ سے یہ مروی ہے کہ اس وقت بھی محض اس خیال سے کہ علم کے چھپانے "کا الزام ان پر نہ رہ جائے" حدیث بیان کرتے جاتے تھے،

(بخاری و مسلم و عام صحاح)

(۵)

ان تمام امور کے ساتھ اس کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہئے کہ جس ذاتِ گرامی کے ہر قول کو وہ خدا کی بات اور خدا کا حکم سمجھتے تھے، اسی نے باربار بکثرت ان کی فطرت مین مشہور حدیث[1] من کذب علی متعمداً فلیتبوء مقعده من النار کے تہدیدی خوف کو اس طرح راسخ کرنے کی کوشش کی تھی، کہ جتنے صحابیون سے یہ حدیث مروی ہے، مشکل ہی سے چند حدیثین اس کی ہم پایہ ہو سکتی ہین، اور نیز قرآن کی رو سے یہ اتنی بدیہی بات تھی، کہ جس قسم کے ایمان و یقین کی دولت سے یہ لوگ سرفراز

[1] جو مجھ پر قصداً جھوٹ باندھے گا، چاہئے کہ اپنا ٹھکانا آگ مین تیار کرے، ۱۲

تھے، اس فعل کی جرأت کس کو ہو سکتی تھی، جس اعلیٰ کردار کے وہ مالک تھے، یون بھی ان سے غلط بیانی کی توقع کون کر سکتا ہے، ماسوا اس کے جب وہ جانتے تھے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کسی امر کا انتساب دراصل اس چیز کو خدا کی طرف منسوب کرنا ہے، اور ایک جگہ نہیں بے شمار آیتون مین قرآن نے مفتری علی اللہ (خدا پر جھوٹ باندھنے والے) کو سب سے بڑا ظالم قرار دیا ہے، کیا قرآن پر ایمان رکھنے والون کیلئے اس کے بعد اس کی کوئی گنجائش ہو سکتی تھی، کہ وہ قصداً العیاذ باللہ اپنے محبوب رسول پر جھوٹ باندھین، یہی وجہ ہے کہ بعض صحابہ تو جس وقت "حدیث" بیان کرنے کے لئے بیٹھتے، قبل کچھ بیان کرنے کے من کذب علی متعمداً والی حدیث کو ضرور پڑھ لیتے تھے، تاکہ ان مین اپنی نازک تاریخی ذمہ داری کا احساس بیدار اور تازہ ہو جائے، امام احمد بن حنبل اپنی مسند مین راوی ہین، کہ خصوصیت کیساتھ ذخیرۂ حدیث کے سب سے بڑے راوی یعنی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ دوامی قاعدہ تھا، کہ

یبتدی حدیثہ بان یقول قال — اپنی حدیث جس وقت بیان شروع

رسول اللہ الصادق المصدوق — کرتے تو کہتے :- فرمایا رسول اللہ صادق

ابو القاسم صلی اللہ علیہ و — و مصدوق ابو القاسم صلی اللہ علیہ وسلم

سلم من کذب علی متعمداً — نے جس نے مجھ پر قصداً جھوٹ باندھا چاہیے

فلیتبوء مقعدہ من النار — کہ اپنا ٹھکانہ آگ مین تیار کرے۔

(اصابہ جلد ۴)

اس کے بعد جو کچھ بیان کرنا چاہتے تھے، بیان فرماتے۔

(باقی)

نظریۂ اضافیت

از

ڈاکٹر سر شاہ سلیمان مرحوم

"ڈاکٹر شاہ محمد سلیمان مرحوم کا آخری خطبۂ صدارت جو رضا اکیڈمی رامپور کے جلسۂ افتتاح مین ۲ر مارچ سنہ ۴۱ء کو پڑھا گیا"

اعلیٰ حضرت خواتین اور حضرات!

یہ بات میرے لئے باعثِ عزت ہے، کہ رضا سائنس اکادمی کا افتتاح کرنے کے لئے مجھے دعوت دیگئی ہے، اعلیٰحضرت کو علوم کی سرپرستی سے جو شغف ہے، اس کا یہ اکادمی ایک زندہ ثبوت ہے، مجھے یقین ہے کہ اس اکادمی کے کارنامے ریاست رامپور مین سائنس اور علوم و فنون کی ترقی مین ایک نئے دور کا آغاز کرین گے، اور میری یہ دلی تمنا ہے کہ اس اکادمی کے حلقۂ اثر مین جو علما کام کرین، ان کی تحقیقات ایسی بار آور ہو کہ علمی دنیا اس سے ہمیشہ دلچسپی لیتی رہے، اعلیٰ حضرت کو تعلیم سے جو دلچسپی ہے، اس کا اعتراف مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے اعلیٰ حضرت کو باتفاق رائے پرو چانسلر منتخب کرکے کرلیا ہے، اور مسلمانون کی اس مادر علمی نے آپ کی خدمتِ عالی مین ڈاکٹر آف لاز کی اعزازی سند بھی پیش کی ہے، اعلیٰ حضرت کے دورِ ہمایونی مین ریاست مین ہر طرف علمی ترقی نظر آتی ہے، رامپور کا ہائی اسکول انٹرمیڈیٹ کے درجہ تک پہنچ گیا ہے، مدرسہ عالیہ مین توسیع کردیگئی ہے، اسکے علاوہ کئی ایک مڈل اسکول اور ایک سو سے زائد دیگر مدرسے ہین، تعلیم نسوان کا بہتر انتظام

ہو گیا ہے، اور ریاست کے مشہور کتب خانہ مین قیمتی مخطوطات کا جو نادر ذخیرہ موجود تھا، اس مین اور بھی اضافہ ہو گیا ہے، چنانچہ اس وقت مشرقی علوم و فنون کی قلمی کتابون کے تقریباً دس ہزار نسخے موجود ہین،

سائنس اور صنعت مین قریبی تعلق پیدا کرنے کی ملک کو اشد ضرورت ہے، اعلیٰ حضرت کے دورِ مسعود مین متعدد نئے کارخانے قائم ہو گئے ہین جن مین رضا شکر فیکٹری اور بجلی اور آبپاشی کے محکمے کی توسیع خاص طور پر قابلِ ذکر ہین، ان کے علاوہ دیا سلائی بنانے، نباتاتی تیل نکالنے اور پھلون کو محفوظ کرنے کے کارخانے قائم ہو گئے ہین، اور پارچہ بافی کا ایک بڑا کارخانہ بھی کھولا گیا ہے اس لئے سائنس اور صنعت کے قریبی تعلق کو عملی شکل دینے کے لئے ضروری تھا، کہ ایک سائنس اکادمی بھی کھولی جائے،

مجھے یقین ہے کہ اعلیٰ حضرت کی مربیانہ سرپرستی مین ریاست رامپور کی خوشحالی اور معاشی بہبودی مین برابر اضافہ ہوتا رہے گا، اس ریاست کا مرتبہ ملک مین اور زیادہ بلند اور ممتاز ہو جائے گا، اور ملک کے وسائل کی ترقی اس کے فرمان روا کی فیض رسانی کے دائرے کو اور بھی وسیع کر دیگی،

نظریون کی حیثیت خیال آرائی سے زیادہ نہین،

سب سے پہلے مین یہ واضح کر دینا چاہتا ہون کہ کل نظریے محض خیال آرائی پر مبنی ہوتے ہین، اور سچ پوچھئے تو نظریے کے معنی ہی خیال آرائی کے ہین، مگر شرط یہ ہے کہ یہ خیال آرائی حقائقِ معلومہ سے مطابقت رکھتی ہو، جب ایسے نئے حقائق دریافت ہوتے ہین جن کی بنا پر پُرانے مسلمہ نظریات قابلِ تسلیم نہین رہتے، تو اہلِ نظر نئے نظریات قائم کرتے ہین، جو زیادہ سہل اور سادہ ہون، اور نئے دریافت کئے ہوئے حقائق سے مطابقت رکھتے ہون،

نوعِ انسانی کی زندگی اس زمانے کے مقابلے مین جب سے کرۂ ارض وجود مین آیا، اس قدر مختصر ہے

کہ کسی شمار مین بھی نہین آتی، اور خود کرۂ ارض کائنات کے اتھاہ سمندر مین ایک قطرے کے برابر بھی نہین، ایسی صورت مین ظاہر ہے کہ بے حقیقت انسان کائنات کی حقیقت کے بارے مین خیال آرائی سے کام لینے یا اندھیرے مین ٹٹولنے سے زیادہ اور کیا کر سکتا ہے، اس کی خیال آرائیان پہلی بار لازمی طور پر غلط اور نامکمل ہوتی ہین، لیکن جون جون اس کا تجربہ بڑھتا جاتا ہے اسکی غلطیون کو ظاہر کرتا جاتا ہے، وہ پُرانے تصورات کو ترک کر کے نئے تصورات اختیار کرتا رہتا ہے، یہی عمل جاری رہتا ہے اور اسکو ہمیشہ جاری رہنا چاہئے، اس لئے کہ کائنات کی حقیقت کبھی اس کے قابو مین نہین آسکتی، یہی حال ان کوششون کا ہے جو انسان کائنات کی اتھاہ گہرائی کو ناپنے کی کرتا ہے، جب سے گیلی لیو نے پہلی دوربین بنائی تھی، برابر زیادہ سے زیادہ طاقت کی دوربینیں بنتی چلی گئیں، مگر پھر بھی فضائے بسیط کی گہرائی اب تک نہیں ناپی جا سکی، اور نہ کبھی ناپی جا سکتی ہے، آلات کی مدد سے انسان کی نظر روز بروز فضا کی گہرائیوں مین گھستی چلی جاتی ہے، مگر اسکی تہ تک وہ کبھی نہیں پہنچ سکتا، اسلئے کہ یہ اسکی طاقت سے باہر ہے،

باوجود اس حیرت انگیز ترقی کے انسان کا علم ابھی بالکل ابتدائی حالت مین ہے، اس طویل زمانے مین جب کہ انسان نے عالمِ حیوانی مین ترقی کے بہت سے مدارج طے کئے ہین اس نے بتدریج معلومات کا بہت بڑا ذخیرہ جمع کر لیا ہے، پھر بھی ہماری مثال ان بچون کی ہے جو علم کے سمندر کے کنارے پر بیٹھے سنگریزے چُن رہے ہون، ہماری انتہائی لاعلمی فوراً ظاہر ہو جاتی ہے جب ہم کائنات کی وسعت کا تصور کرنے کی کوشش کرتے ہین، اگر آپ اسے ملحوظ رکھین کہ آفتاب اسی کھرب سال سے موجود ہے، اس زمین کی عمر جس پر کہ ہم بستے ہین، دو ارب سال ہے اور زمین پر زندگی کے آثار نمایان ہوئے تیس کروڑ سال گذر چکے ہین، مگر اس کے مقابلہ مین انسان کا وجود صرف تین لاکھ سال سے ہے اور ذی عقل انسان کا صرف پندرہ بیس ہزار سال سے ہے تو یہ

حقیقت عیان ہو جاتی ہے، کہ یہ چند ہزار سال کا زمانہ جس مین کہ انسان نے اپنی معلومات فراہم کی ہین، اس طویل زمانہ کا ایک نہایت خفیف سا جز ہے جو کہ کائنات کے اسرار کو معلوم کرنے کے لئے درکار ہے، ہماری عقل کو عاجزی کے ساتھ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس کائنات کی حدود لا انتہا اور اس کا دائرہ نامحدود ہے،

ہمارے دائرۂ نظر کی تنگی

جس طرح ہماری نظر کا دائرہ محدود ہے، اور ہم ایک مخصوص جسامت سے چھوٹی چیزون کا مشاہدہ نہین کر سکتے، اور ایک مخصوص فاصلہ سے آگے اجسام کو نہین دیکھ سکتے، اسی طرح کائنات کے متعلق ہمارا علم بھی ایک تنگ دائرے مین محدود ہے، جس کے آگے یا پیچھے کی ہمین کوئی خبر نہیں، گذشتہ پچاس برس کی جد و جہد سے علماے سائنس نے ایسے چھوٹے چھوٹے ذرون کا انکشاف کیا ہے جو زمانہ ماقبل مین انسانی مشاہدہ سے باہر تھے، اب مادے کو سالمات پر مشتمل سمجھا جاتا ہے، جو جوہر فرد سے مرکب ہین، ہر جوہر فرد کا ایک مرکزہ ہے جس کے ارد گرد برقی پارے حرکت کرتے رہتے ہین، مرکزہ میں ایک Neutron اور ایک Positron ہے جن کے متعلق ہم کم سے کم اتنا کہہ سکتے ہین، کہ وہ دونون ایک ہی نوعیت کے ہین، ایک برقیہ جس کا قطر سینٹی میٹر کا $\frac{1}{5\times10^{3}\times10^{7}}$ پانچ ہزار کروڑوان حصہ ہو، اور جو اپنے مرکزہ کے چارون طرف ایک سکنڈ میں کروڑوں مرتبہ چکر کاٹتا ہو، اس کے تصور کی کوشش کرنا سعیٔ لاحاصل ہے، اور پھر ہم یہ بھی نہین کہہ سکتے، کہ یہ اندرونی عالمون کی آخری حد ہے، ممکن ہے ان عالمون کے اندر ان سے بھی چھوٹے عالم ہون، شاید ان مین سے بعض کا انسان آگے چل کر پتہ چلا لے، پھر بھی بہت سے ایسے ہون گے جو ہمارے دائرۂ ادراک سے باہر رہین گے، اور غالبًا ہم ابد تک ان کی حقیقت کا پتہ نہیں چلا سکیں گے،

انسان کی کم مائگی

آیئے ذرا تصویر کا دوسرا رُخ بھی دیکھین انسان اپنے گرد و پیش کی دنیا

مین اپنے آپ کو ایک ناچیز سی مخلوق پاتا ہے، یہ زمین جس پر کہ وہ سکونت پذیر ہے، ایک بہت بڑا کرہ ہے، جس کا محیط تقریبًا ۲۵ ہزار میل ہے، مگر پھر بھی اس آفتاب سے جو ہمیں روشنی دیتا ہے کہین چھوٹا ہے، آفتاب جسامت کے اعتبار سے زمین سے ۱۳ لاکھ گنا بڑا ہے، مگر ہمارا یہ عظیم الشان آفتاب بھی ایک چھوٹے سے نقطے یا کائنات کے اتھاہ سمندر مین ایک قطرہ کی حیثیت رکھتا ہے، تقریبًا ......۴۰ × ۱۰۶ (چار کھرب) ستارے ایسے ہین، جو بجاے خود آفتاب ہین، ان مین سے کچھ ہمارے آفتاب سے چھوٹے اور کچھ اس سے کئی گنا بڑے ہین، ان ہی سے ہمارا کہکشانی نظام بنتا ہے، جسکی حد بندی کہکشان کرتی ہے، روشنی کو ۱۸۶۰۰۰ میل فی سکنڈ کی زبردست رفتار سے آفتاب سے چل کر زمین تک پہنچنے مین ۸ منٹ لگتے ہین، لیکن قریب ترین ستارے بھی اتنے دور ہین، کہ ان سے روشنی کو زمین تک پہونچنے مین چند منٹ، چند گھنٹے، چند دن، چند ہفتے یا مہینے نہین بلکہ ۴½ سال اور بعض حالتون مین تو اوس سے بھی زیادہ عرصہ لگتا ہے، یہ تو قریب ترین ستارون کا ذکر ہے، کہکشان کا قطر اتنا بڑا ہے کہ روشنی کو باوجود اس شدید تیز رفتاری کے اوس کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہونچنے مین ۲۲۰۰۰۰ سال لگ جاتے ہین، اور ہمارے اس عظیم الشان کہکشانی نظام کے اس طرف کروڑون اور کہکشانی نظام ہین، جو کوہ ولسن کی سو انچ قطر کی دوربین کی مدد سے مشاہدے مین آئے ہین، ان سحابیون کا فاصلہ ناقابل تصور ہے، ان مین سے بعض دور دراز سحابیون سے روشنی کو باوجود اتنا تیز رفتار ہونے کے زمین تک پہونچنے کے لئے چوبیس کروڑ سال چاہئین، امریکہ کے دولتمندون کی دریا دلی سے اب دو سو انچ قطر کی دوربین بنانے کی نوبت آئی ہے، یہ دنیا کی سب سے بڑی دوربین ہو گی، خوش قسمتی سے یہ دوربین بن چکی ہے، لیکن ابھی اس حد تک مکمل نہیں ہوئی، کہ اس سے کام لیا جا سکے، یہ توقع کیجاتی ہے، کہ اس دوربین مین خالی آنکھ سے دس لاکھ گنا زیادہ روشنی داخل ہو گی، اسکی مدد سے ہم زیادہ فاصلے کے کثیر التعداد فلکی نظامون

کو دیکھ سکین گے، اگر پھر بھی ہمارا علم کائنات یقیناً نامکمل رہے گا، جون جون ہمارا سائنس اور فلکیات کا علم ترقی کرتا جائے گا، جس کی ہمین ہر طرح سے توقع ہے، یقیناً ہماری معلومات ایک طرف چھوٹے سے چھوٹے، اور دوسری طرف بڑے سے بڑے عالمون کے متعلق وسیع سے وسیع تر ہوتی جائے گی، مگر باوجود اس قدر ترقی کے ہمارا علم بہرحال نامکمل ہی رہے گا، ہم کائنات کی وسعت کی صرف ایک جھلک ہی دیکھ پائین گے، اور فضاے بسیط کی حقیقی گہرائی کے متعلق جو تصورات اور نظریات بھی قائم کرین گے، ان کی حیثیت خیال آرائی سے زیادہ نہ ہوگی،

عالم ماوراے عالم انسانی تخیل کی رسائی حدِ نظر سے کہین آگے ہے، وہ بے تکلف یہ تصور کر سکتا ہے کہ ممکن ہے یہ کروڑون کہکشانی نظام خود ایک مافوق کہکشانی نظام کے اجزا ہون جسکا عمل ہمارے کہکشانی نظام سے ملتا جلتا ہو، تخیل اور اونچا اڑکر ایک فوق الفوق کہکشانی نظام فرض کر سکتا ہے جو کروڑون مافوق کہکشانی نظامون پر مشتمل ہو، تخیل جہان تک چاہے بڑھتا چلا جائے لیکن مشاہدہ کائنات کی اس عظیم الشان وسعت کی پیمایش سے قاصر ہے، اور قاصر رہے گا، جو آئن اسٹائن کا سا بے باک تخیل رکھتا ہو، وہی یہ کر سکتا ہے، کہ فضاے بسیط کو محدود اور دائرۂ ادراک کے اندر سمجھ لے، اور اس کے نصف قطر کا تخمینہ بھی لگالے، ایڈنگٹن نے اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھکر یہ معلوم کیا ہے کہ پوری کائنات کے برقیوں کی کل تعداد 1.29×10^{79} ہے، خوشی کی بات ہے کہ حال مین آئن اسٹائن نے مجبور ہوکر محدود فضا کے فرضیے کو ترک کر دیا ہے، انسان کی یہ کوشش کہ وہ کائنات کے عرض و طول کی پیمایش کرے، انتہائی گستاخی ہے، اسے یہ اعتراف کر لینا چاہئے، کہ وہ اس وسیع قلمرو کی وسعت اور گہرائی کی پیمایش سے قاصر ہے،

زبردست معمہ اگر ہم کائنات کی ساخت کے متعلق حکما کے خیالات کی نشو و نما کا مطالعہ کرین تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کس طرح یکے بعد دیگرے متعدد نظریئے قائم اور ترک کئے گئے،

سورج اور چاند کا طلوع و غروب، ثوابت اور سیارے ابتدائی زمانہ کے ہیئت دانون کیلئے ایک زبردست معمہ تھے، بابل کے ہیئت دانون نے یہ دریافت کیا تھا، کہ سال مین ۳۶۰ دن ہوتے ہین، وہ اسکو بارہ قمری مہینون مین تقسیم کرتے، اور پھر وقتاً فوقتاً ان مین لوند کے مہینون کا اضافہ کرکے اس کو شمسی سال مین تحویل کر لیا کرتے تھے، آسمان کو انھون نے بارہ حصون یا برج مین تقسیم کیا تھا، ہر ایک برج کے لئے ایک نشان مقرر تھا جو کسی خیالی دیوتا یا جانور کو ظاہر کرتا تھا، بروج کی مقررہ علامتون کے متعلق ان کا عقیدہ تھا کہ اجرامِ فلکی کے ساتھ مل کر یہ انسانی اعمال پر اثر انداز ہوتے ہین، اس اوہام پرستی سے علم نجوم نے جنم لیا، جو کہ ابتک پوری طرح مٹنے نہین پایا ہے، وہ زمین کو چپٹا تصور کرتے، اور کائنات کو ایک بند گنبد سے تشبیہ دیتے اور سطحِ زمین کو اس کا فرش سمجھتے تھے، دریاے فرات کے منبع کو مرکز زمین قرار دیکر انھون نے یہ فرض کر لیا تھا، کہ زمین کے چارون طرف پانی اور اس سے آگے سر بفلک پہاڑ ہین، جن پر گنبد افلاک قائم ہے، ان کا یہ تصور فطری تھا، اس لئے کہ ان کی اپنی سلطنت پہاڑون اور سمندر سے گھری ہوئی تھی، وہ اس تصور کی حقیقت پر کامل یقین رکھتے تھے،

مصریون کا تصور کائنات بھی اہلِ بابل کے تصور کے مشابہ تھا، ان کا خیال تھا، کہ زمین ایک مستطیل صندوق ہے، جس کا طول شمالاً جنوباً پھیلا ہوا ہے، اور بیضوی مجوف شکل کا ہے، جس کے مرکز مین مصر کا ملک واقع ہے، ان کا یہ تصور دریاے نیل کے ساتھ ساتھ پھیلی ہوئی نوآبادی سے مطابقت رکھتا تھا، آسمان کو ایک محراب نما چھت سمجھتے تھے، جسے چارون کنارون پر پہاڑون کی چار چوٹیان بطور ستونون کے اٹھائے ہوئے ہین، اور ستارون کو ایک قسم کے چراغ جو سیدھے تصور کرتے تھے جس کی ڈوری سے لٹک رہے ہین، اس صندوق کے اردگرد ایک بہتا ہوا دریا تصور کرتے تھے جس مین ایک آتشین قرص لئے ہوئے ایک کشتی تیرتی پھرتی ہے، یہ ان کا سورج تھا، دریاے نیل

اس فلکی ندی کی ایک شاخ سمجھی جاتی تھی، اہلِ مصر کو کائنات کے اس تخیل کی حقیقت مین ذرہ بھی شبہہ نہ تھا،

اگرچہ قدیم اہلِ ہند نے علمِ ہیئت کے متعلق بہت سی قابلِ قدر معلومات فراہم کرلی تھیں لیکن ان کا عقیدہ تھا کہ زمین ایک مسطح گول قرص ہو جس کو ایک گاے اپنے سینگ پر اٹھائے ہوئے ہو اور جب کبھی گاے زمین کو ایک سینگ سے دوسرے سینگ پر منتقل کرتی ہے، تو اس کے سر کی جنبش سے زلزلہ آتا ہو، یہ عقیدہ اب بھی اس ملک کے بعض دماغون مین جاگزین ہو،

متضاد نظریات اہلِ یونان کو اس سلسلہ مین اولیت کا شرف حاصل ہے، کہ انھون نے ہیئت کو علمی بنیادون پر قائم کیا، حکیم طالیس (جو اصل مین فنیقی تھا) کا شمار یونان کے حکماے ہفتگانہ مین ہوتا ہے، اس کا زمانہ چھ سو سال قبل مسیح تھا، یہ پہلا شخص ہے جس نے آسمان کا خاکہ کھینچ کر دو ستارون کے مقابلہ مین سورج اور چاند کے محلِ وقوع کو ظاہر کیا، اس طرح وہ اجرامِ فلکی کی حرکات کا زیادہ صحت کے ساتھ پتہ لگانے مین کامیاب ہوا، چھٹی صدی قبل مسیح مین حکیم فیثا غورث سب سے پہلا شخص تھا، جو اس حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ دور سے آنے والے جہازون کے مستول سب سے پہلے دکھائی دیتے ہین، اس نتیجہ پر پہونچا کہ زمین کی شکل کرہ نما ہے، اسی نے اس مسئلہ کو بھی پیش کیا، کہ آفتاب نظامِ فلکی کا مرکز ہے، فیثا غورث کو نظریۂ مرکزیتِ شمس (Heliocentric theory) کا بانی سمجھنا چاہئے، تقریباً ۲۵۰ قبل مسیح مین ہیراقلیط نے فیثا غورث کے خیال سے اختلاف کرتے ہوئے یہ بتایا کہ زمین فضا کے وسط مین اپنے محور پر گردش کرتی ہے اور جب کہ سورج اور بڑے سیارے زمین کے گرد حرکت کرتے ہین، زہرہ اور عطارد سورج کے اردگرد گھومتے ہین، مرکزیتِ ارض کا یہ نظریہ قریب تین سو سال تک مسلمہ رہا، ۳۱۰-۲۳۰ قبل مسیح مین ارسطارکوس نے جو عہد قدیم کا کوپرنیکس کہلاتا ہے، چاند گرہن کی مدد سے

تخمینہ لگا کر سورج اور زمین کے قطر کی باہمی نسبت معلوم کرکے ثابت کیا کہ سورج زمین سے بہت بڑا ہے، اس کا تخمینہ تو غلط تھا، مگر اس کا طریقِ عمل معقول تھا، اسی نے یہ فرضیہ بھی پیش کیا، کہ زمین کی دو گردشین ہین یعنی یہ کہ اپنے محور پر گھومنے کے علاوہ سورج کے مرکز کے گرد ایک دائرہ نما مسیر پر بھی گردش کرتی ہے، اور چونکہ بعض ثوابت باوجود اس گردش کے آسمان مین اپنی جگہ پر قائم دکھائی دیتے ہین، وہ اس نتیجہ پر پہونچا کہ یہ ثوابت بے انتہا فاصلے پر ہون گے، اس کا یہ تصور تھا کہ پورا نظامِ شمسی اس بے پایان فضا مین محض ایک نقطہ کی حیثیت رکھتا ہے، ان ستارون کے فاصلے کو زمین کے مسیر سے وہی نسبت ہے جو کسی کرہ کے نصف قطر کو اس کے مرکز سے ہوتی ہے،

لیکن مرکزیتِ ارض کا نظریہ کہ زمین گردش کا مرکز ہے، بہرحال رائج ہوگیا، اور ہپرکوس (۱۳۰ قبل مسیح) نے سورج چاند اور اجرامِ فلکی کی ظاہری حرکت کی توجیہ اس مفروضے کی بنیاد پر کی کہ یہ سب ایسے شفاف کرون مین گھومتے ہین جو زمین کے ساتھ ہم مرکز ہون،

بطلیموسی چکر دوسری صدی عیسوی (۱۵۱-۱۲۷ء) مین مصر مین مشہور ریاضی دان بطلیموس کا ظہور ہوا، چونکہ اجرامِ فلکی یکسان طور پر گردش نہین کرتے تھے، اس لئے بطلیموسی نظام کو ان کی داخلی حرکت کی تشریح کے لئے متعدد افلاک اور ان کے ساتھ بڑے اور چھوٹے چکرون کا ایک پیچیدہ سلسلہ فرض کرنا پڑا، بطلیموس نے کہا کہ زمین کائنات کے وسط مین اپنی جگہ پر قائم ہے، اور افلاک اس کے گرد ۲۴ گھنٹے مین ایک بار گھومتے ہین، اس کے یہ معنی ہوئے کہ کل افلاک، سورج، چاند، اجرامِ فلکی اور ان ستارون سمیت جو ان مین جڑے ہوئے ہین، زمین کے اردگرد ۲۴ گھنٹے مین ایک بار گھوم جاتے ہین، آسمان کے متعلق یہ خیال تھا کہ وہ ٹھوس اور گنبد نما شکل کا ہے، اور اپنے زبردست محور پر گھومتا ہے، اور ستارے اسکی سطح مین جڑے ہوئے ہین، اس کا یہ مطلب ہوا کہ تمام آسمان بلوری کرون سے معمور ہے، اور یہ بلوری کرے اجرامِ فلکی کو اپنے چھوٹے اور بڑے چکرون مین

گھماتے ہین، اوس کے دلائل حسب ذیل تھے :-

۱۔ جب کوئی شخص ایک جگہ کھڑا ہوکر اُچھلتا ہے، تو اوس کے پاؤن کے نیچے کی زمین آگے نہین نکل جاتی، اور اگر زمین متحرک ہوتی، تو اچھالے ہوئے اجسام پیچھے رہ جاتے، اور جس نقطے سے انھین اچھالا گیا ہے، اس کے مغرب کی جانب گرتے، اسلئے کہ اس اثنا مین ان کے نیچے کی زمین آگے بڑھ چکی ہوتی،

۲۔ بادل ہمارے سر پر مشرق سے مغرب کو حرکت نہین کرتے، اور اگر زمین گھوم رہی ہوتی تو ان کا طریق عمل ضرور ایسا ہوتا، اسلئے کہ وہ زمین کے ساتھ بندھے ہوئے نہین،

۳۔ خط استوا پر ان چیزون مین جو زمین مین پیوست نہین ہین، شدید حرکت پیدا ہوجاتی، وہ اُڑ کر بکھر جاتین، اور زمین پاش پاش ہو جاتی، ظاہر ہے کہ اگر کوئی قوتِ کشش موجود نہ ہوتی تو ان کی حالت ان سنگ ریزون کی مانند ہوتی جو کسی متحرک پہیئے پر رکھدیئے گئے ہون۔

۴۔ جون جون زمین اپنے میر پر حرکت کرتے ہوئے فضا مین طویل فاصلے طے کرتی، تو ستارے آپس مین جگہ بدلتے ہوئے دکھائی دیتے،

ہپرکوس و بطلیموس کا پیش کردہ نظام گو تفصیلات مین الجھا ہوا تھا، تاہم وہ سورج چاند اور اجرام فلکی کی ظاہری حرکت کی توجیہ اس مفروضے کی بنا پر کرسکتے تھے، کہ ہر مادی جسم ایک میر یا چھوٹے چکرون پر گھومتا ہے، اور خود یہ میر زمین کے گرد عظیم الشان مدور میر پر گردش کرتا ہے، بطلیموس ان چھوٹے بڑے چکرون کی حالت اور ان کی وسعتِ مشاہدہ کی مدد سے متعین کرنے مین کامیاب ہوا، اور کچھ جدولین بھی تیار کرلی تھین جن کی مدد سے فلکی اجسام کی آیندہ جاے وقوع اور سورج اور چاند گرہن کے اوقات کے متعلق بھی پیشین گوئی کی جاسکتی تھی، البتہ اس نے اس رفتار کا حساب نہین لگایا جو کہ دور دراز ستارون کو زمین کے ارد گرد چوبیس گھنٹے

مین ایک بار گھومنے کے لئے درکار ہے، اگرچہ یہ نظام ہمین آج کل مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے، مگر دنیا کے علماے ریاضی سائنس اور فلسفہ تقریباً ۱۴۰۰ سال تک اسکو سب سے زیادہ مکمل اور حقیقت کے مطابق مانتے رہے، عرب ہیئت دان تو صدیون تک اس پر جمے رہے، اور قرونِ وسطیٰ مین ان کی بدولت یہ نظام تمام یورپ مین رائج ہو گیا، بطلیموس کے نتائج بالکل ناگزیر سمجھے جاتے تھے،

الفرغانی نے نہ صرف بطلیموسی نظام اور اس کے استقبال اعتدال کی قیمت کو تسلیم کیا بلکہ یہ خیال قائم کیا کہ یہ نظام ستارون کے علاوہ اجرام فلکی پر بھی حاوی ہے، نوین صدی عیسوی مین ثابت بن قرہ نے حرکات اجرام فلکی کے بطلیموسی نظریہ کو ایک نوین کرے کا اضافہ کرکے بہتر بنانے کی کوشش کی، تاکہ اعتدالین کی فرضی غیر استقلالی کیفیت کی توجیہ ہو سکے، آگے چل کر البطانی نے اس نظریہ کی مناسب طور پر تردید کی،

نظریہ کوپرنیکس

نکوس کوپرنیکس (۱۴۷۳-۱۵۴۳) جو پروشیائی پولینڈ مین پیدا ہوا، پہلا شخص تھا جس نے یہ معلوم کیا کہ بطلیموس کے نتائج مین کوئی بنیادی غلطی ہے، اوس نے محسوس کیا کہ ارسٹارکس کے اس خیال کو تسلیم کرنے مین زیادہ سہولت ہوگی کہ سورج زمین کے گرد نہین گھومتا، بلکہ زمین اور دوسرے اجرام فلکی سورج کے گرد گھومتے ہین، وہ اپنے آپ کو قدما کا خوشہ چین سمجھتا تھا، اوس نے بطلیموس کی دلیلون کا یہ الزامی جواب دیا، کہ اگر آسمان متحرک ہوتا تو چونکہ اس کا محیط بہت بڑا ہے، وہ زیادہ تیزی سے گردش کرتا، اور ٹکڑے ٹکڑے ہوکر بکھر جاتا، اگر زمین قائم ہوتی اور آسمان گردش کر رہا ہوتا، تو سطحِ آسمان منتشر ہو جاتی، اور تمام ستارے ادھر ادھر بکھر جاتے، لیکن ایسا نہین ہوتا، آگے چل کر اوس نے اجرام فلکی کی رجعت قہقری کی توجیہ کی، جو کہ اوس سے پہلے ایک چیستان سمجھی جاتی تھی، اس کے علاوہ اوس نے زمانہ اعتدالین کی صحت کے اس نظریہ کی بھی توجیہ پیش کی جس کو اوس سے پہلے ہپرکوس ۱۵۰ قبل مسیح مین دریافت کر چکا تھا، مگر کوپرنیکس کا خیال

تھا کہ تمام ستارے اپنی جگہ پر قائم ہین، اوران کا فاصلہ سورج سے ہمیشہ یکسان رہتاہے،

اس زمانہ مین یہ ایک ایسا انقلاب انگیز خیال تھا، کہ اس پر عیسوی کلیسا کا قہر وغضب نازل ہونا لازمی تھا، کلیسا زمین کو جو انسان کا مسکن اور حضرت عیسیٰ کا مہبط ہے، کائنات مین سب سے اہم چیز سمجھتا تھا، اور اسکی غیر معمولی اہمیت کو قائم رکھنے کیلئے یہ تصور ضروری تھا، کہ وہ ایک مرکز ہے، جس کے گرد آسمان گھومتے ہین، کوپرنکیس نے اپنے نئے نظریہ کی تائید مین کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے، ایک کتاب لکھی لیکن کلیسا کے تشدد کے خوف سے اس کی اشاعت کو روکے رکھا، یہان تک کہ اسکی موت قریب آپہنچی، اب اوس نے یہ کتاب چھپوائی، لیکن اُسے اپنی تصنیف کا پہلا مطبوعہ نسخہ ٹھیک اوس دن ملا، جس دن اوس نے داعی اجل کو لبیک کہا، پہلے پہل تو اسکی کتاب کو نظر انداز کیا گیا لیکن بعد مین کلیسا نے اس کا پڑھنا قطعاً ناجائز قرار دیدیا، یہ مسئلہ جسے کوپرنکیس نے دوبارہ دریافت کیا تھا، علم ہیئت کی تاریخ کا ایک عہد آفرین واقعہ تھا، مگر اس کا اعتراف کرنا تو در کنار کلیسا نے اس کتاب کی اشاعت ممنوع قرار دیدی، آخر کار ۱۸۲۲ء مین جب کہ کوپرنکیس کی وفات کو ایک مدت گذر چکی تھی، پاپاے اعظم نے مرکزیت شمس کے نظام کو باضابطہ طور پر تسلیم کیا،

سولھوین صدی کے نصف آخر مین (سنہ ۱۵۴۶-۱۶۰۱ء) ٹائیکو براہی نے کوپرنکیس کی تصنیف کا مطالعہ کیا، لیکن زمین کے سورج کے گرد گھومنے کا وہ قائل نہین ہوا، اس نے اس بات کو تسلیم کیا کہ زمین کے علاوہ باقی تمام سیارے سورج کے گرد گھومتے ہین، لیکن اس بات مین وہ بطلیموس کا ہم خیال تھا، کہ سورج مع تمام سیارون کے زمین کے گرد گردش کرتا ہے، جو ساکن اور اپنی جگہ پر قائم ہے، بہر حال ٹائیکو براہی نے اپنی تحقیقات سے علم ہیئت مین قابل قدر اضافے کئے اور چاند کی حرکت کے کچھ نئے قانون بھی دریافت کئے،

کیپلر کے قوانین اجرام فلکی

پروشیا کا جون کیپلر (سنہ ۱۵۷۱-۱۶۳۰ء) جو ٹائیکو براہی کا چیلا تھا، اپنے استاد سے بھی بڑا ہیئت دان ثابت ہوا، اس نے کوپرنکیس کے نظریہ کی طرف رجوع کرتے ہوئے معلوم کیا کہ تمام اجرام فلکی سورج کے گرد بیضوی میرون پر چکر کاٹتے ہین، اس کے علاوہ اوس نے حرکت اجرام کے تین قانون دریافت کئے، جو اسی کے نام سے موسوم ہین، ان قوانین کی مدد سے یہ بتایا جا سکتا ہے، کہ کس سیارے کی جگہ اپنے میر مین اس وقت کہان ہے، یا فلان وقت کہان تھی، کیپلر کے قوانین جدید علم ہیئت کی اساس ہین، جو بالکل علمی اصولون پر بنی ہے،

ارسطو کا تصور

متقدمین کے لئے اجرام فلکی کی مسلسل حرکت ایک معمہ بنی رہی، ارسطو کا تصور افلاطون کے برعکس یہ تھا کہ مسلسل حرکت کے لئے ایک مسلسل قوت محرکہ کی ضرورت ہے، اس بنا پر اوس نے ایک قائم محرک (Unmoved Mover) فرض کر لیا، ارسطو کے نظریہ کے مطابق تمام اجسام بالجسم بھاری یا ہلکے ہوتے ہین، اوران کے گرنے یا اچھلنے کی رفتار ان کے بھاری پن یا ہلکے پن کے متناسب ہوتی ہے، اس لئے کہ وہ ہمیشہ اپنی حقیقی جگہ کے متلاشی رہتے ہین، ارسطو کا خیال تھا کہ ایک ہی مادہ کے بنے ہوئے دو اجسام کو یکسان بلندی سے ایک ساتھ گرایا جائے تو زیادہ بھاری جسم بمقابلہ ہلکے جسم کے زمین پر پہلے گریگا، اور گرنے کے وقت اور اوس کے وزن مین نسبت معکوس ہوگی، ۱۵۰۰ سال تک نہ تو کسی نے اس پر کوئی اعتراض کیا، اور نہ اوس کو تجربہ کی کسوٹی پر پرکھنے کی زحمت گوارا کی،

گیلی لیو کا قانون حرکت

۱۵۹۱ء مین اٹلی کے ایک عالم گیلی لیو (۱۵۶۴-۱۶۴۲ء) نے ایک سو پونڈ وزنی اور دوسرا ایک پونڈ وزنی گولا لے کر دونون کو بیک وقت پیسا کے مائل مینار کی چوٹی سے گرایا، اوس نے معلوم کیا کہ یہ دونون گولے ایک ساتھ زمین پر پہونچتے ہین، اوس کے بعد اوس نے

یہ دریافت کیا، کہ زمین کی طرف گرتے ہوئے اجسام کی رفتار مین بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے، اوس نے ارسطو کے اس خیال کی تردید کی کہ طے شدہ فاصلہ وقت کے تناسب ہوتا ہے اور اس کی بجائے یہ دریافت کیا کہ طے شدہ فاصلہ وقت کے مربع کے تناسب ہوتا ہے، گیلی لیو نے یہ بھی دریافت کیا، ایک جسم ڈھلوان سطح پر لڑھکنے کے بعد اپنے اندر معیارِ حرکت رکھتا ہے اور کسی دوسری ڈھلوان سطح پر اسی بلندی تک اوپر کو پھسلنے کی صلاحیت رکھتا ہے بشرطیکہ اس کے راستے مین مزاحمت اتنی خفیف ہو کہ ناقابلِ شمار ہو، پس گیلی لیو کی تحقیقات سے یہ بات حتمی طور پر مان لی گئی کہ ارسطو کے خیال کے برعکس حرکت کے بجائے ابطاء یعنی حرکت کے سُست پڑ جانے کو خارجی قوت کی ضرورت ہوتی ہے، گیلی لیو نے علم ریاضی کی نئی شاخ ارضی حرکیات کی بنا ڈالی، اور فاصلے اور وقت کے قدیم تصورات کو ریاضیاتی شکل مین مرتب کیا، پیسا کے بڑے گرجا گھر مین اوس نے ایک معلق قندیل دیکھ کر یہ نتیجہ اخذ کیا، کہ خواہ اس کے جھولنے کا فاصلہ بڑا ہو یا چھوٹا اس کی ضربین بالکل باقاعدہ ہوتی ہین، اس مشاہدہ کی بنا پر اوس نے رقاص ایجاد کیا، ۱۶۰۹ء مین گیلی لیو کو معلوم ہوا کہ ہالینڈ کے کسی شخص نے نئی قسم کا ایک شیشہ ایجاد کیا ہے، جس مین سے دور کی اشیا بڑی دکھائی دیتی ہین، چنانچہ اوس نے بہت جلد ایک دوربین تیار کر لی، اور اسکی مدد سے اس نے چاند کی سطح کو دیکھا، اور پھر کہکشان کو دیکھکر معلوم کیا، کہ اس مین لاتعداد ستارے ہین، جو خالی آنکھ سے نہیں نظر آتے، اس نے یہ بھی معلوم کیا، کہ مشتری کے چار توابع ہین، اور یہ سیارہ گویا ایک مختصر سا نظام شمسی ہے، اس نے نہایت کامیابی کے ساتھ ان توابع کی گردش کے زمانون کا تخمینہ لگایا، گیلی لیو نے یہ بھی دریافت کیا کہ سورج اپنے محور پر گھومتا ہے، اس نے بطلیموسی نظام کے مقابلہ مین کوپرنکس کے نظریہ کی تبلیغ شروع کی، لیکن باوجود ان کا رہائے نمایان کے محکمۂ احتساب نے اسے بلا کر یہ حکم دیا کہ وہ اس نظریہ کے باطل ہونے کا اقرار کرے، اس عقوبت

کے خوف سے جس کی کہ اس کو دھمکی دی گئی تھی، اوس نے اپنے خیالات کی تبلیغ بند کر دی، اس کے کچھ عرصہ بعد جب گیلی لیو نے ایک کتاب شائع کی جس مین زمین کا سورج کے گرد گھومنا ثابت کیا گیا تھا، تو کلیسا نے اوس کو انجیل مقدس کی تعلیمات کے صریحاً خلاف سمجھتے ہوئے اسے الحاد کے الزام مین نظر بند کر دیا،

نیوٹن کا قانون کشش ثقل

اسحاق نیوٹن (۱۶۴۲-۱۷۲۷ء) ۱۶۶۵-۶۶ء کے دوران مین سیارون کے مسائل کی تحقیقات مین منہمک تھا، لیکن اس نے اپنے نتائج کی اشاعت کو ۱۶۸۵ء تک ملتوی رکھا، جب کہ اوس نے اپنے قانون معکوس مربع کے ثبوت مین یہ بات دریافت کر لی کہ کشش ثقل کی وجہ سے کھینچنے والے مادہ کا ایک گولا اپنے اردگرد کے اجسام کو اس طرح کھینچتا ہے، گویا اسکی ساری کی ساری کمیت اس کے مرکز پر سمٹ آئی ہے، اب تک وہ اس سے ڈرتا تھا، کہ جو اجسام فاصلے پر واقع ہین، ان کے عملِ کشش کی توجیہ کس طرح کریگا، اس اثنا مین کرسچین ہیوگنز نے ایک دائرہ کے گرد گھومنے والے جسم کی اسراع کو ثابت کیا، یہی وہ شخص ہے جس نے سب سے پہلا آپ ہی آپ چلنے والا گھنٹہ بنایا، جو فلکیات کے کامون کے علاوہ طول البلد کا تعین کرنے میں خاص طور پر مفید ہے، ہک اور ہیوگنز دونون نے ثابت کیا کہ اگر سیارون کے میرون کو دائرہ نما مان لیا جائے، تو لازمی طور پر معکوس مربع کا قانونِ قوت کارفرما ہوگا، یہ حقیقت ہیوگنز کے قیمت اسراع کے ثبوت اور کیپلر کے دوری اوقات کے مربعون کے تیسرے قانون سے خود بخود واضح ہو جاتی ہے، سر اسحاق نیوٹن نے درخت سے گرتے ہوئے سیب پر غور کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا، کہ یہ واقعہ قانون کشش ثقل ہی کا نتیجہ ہے، اور یہی قانون پہاڑ پر چڑھنے والے شخص پر بھی عائد ہوتا ہے، خواہ وہ کتنی بلندی پر پہونچ جائے، عملِ استقرار کی مدد سے اسے یہ عجیب و غریب نکتہ سوجھا، کہ شاید چاند کی حرکت بھی اسی قانون کی تابع ہو، اور سورج کے گرد گھومنے والے تمام سیارون کی حرکت بھی، نیوٹن

یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہوگیا کہ معکوس مربع کا قانون چاند کی حرکت پر صادق آتا ہے، اس
نے اپنی کتاب Principia جو علم سائنس کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتی ہے
۱۶۸۷ء میں شائع کی، نیوٹن نے گیلی لیو کے قوانینِ حرکت کو از سرِ نو زیادہ صحیح الفاظ میں منضبط
کیا، یہ قوانین پورے براعظم یورپ میں تو نہیں لیکن جزائر برطانیہ میں نیوٹن کے قوانینِ حرکت
کے نام سے موسوم کئے جاتے ہیں، اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ گیلی لیو، ہیوگنز اور نیوٹن جدید
مکانک کے بانی ہیں،

کششِ ثقل کی رفتار نیوٹن نے کششِ ثقل کا کوئی ثبوت دینے کی کوشش نہیں کی جس کا قانون اس
نے مرتب کیا تھا، ہیوگنز کا اعتراض اس قانون پر یہ تھا کہ فاصلے پر کشش کا اثر ممکن ہی نہیں، اس
اعتراض کو رفع کرنا نیوٹن کے لئے مشکل ہوگیا، نیوٹن کا بنیادی مفروضہ یہ تھا، کہ کششِ ثقل کا عمل
فوری ہوتا ہے، اس لئے اس کا اثر ہر فاصلے پر فوراً ظاہر ہوتا ہے، خواہ وہ کتنا ہی دور دراز کیوں
نہ ہو، بلا لحاظ اس کے کہ جسم معمول ساکن ہے یا متحرک، اور اگر متحرک ہے تو رفتارِ حرکت کیا ہے،
فوری اثر کا ریاضی کی زبان میں یہ مفہوم ہے کہ کششِ ثقل کی رفتار لامحدود ہے، اور ہر متحرک جسم کی نسبت
سے ہمیشہ یکسان رہتی ہے، خواہ وہ کتنی ہی تیز رفتاری سے گھوم رہا ہو،

لاپلاس نے محدود رفتار کے فرضیہ کی تحقیقات شروع تو کی لیکن سوء اتفاق سے اُسنے
ابتدا ہی سے یہ خیال قائم کرلیا، کہ تمام کائنات ایک قسم کے سیال واسطہ سے معمور ہے جو اپنے دباؤ
سے اپنے اندر ڈوبے ہوئے اجسام پر کششِ ثقل کا اثر پیدا کرتا ہے، اس فرضیے سے لازمی طور پر
یہ نتیجہ نکلا کہ کششِ ثقل کھینچنے والے جسم سے کھنچنے والے جسم کی طرف ہوتی ہے، تب لاپلاس نے یہ
دریافت کیا کہ اگر کششِ ثقل کی رفتار محدود ہوتی، تو ایک سیارے کے مسیر میں بہت بڑا
خلل پڑ جاتا، البتہ اگر کششِ ثقل کی رفتار روشنی کی رفتار سے کئی کروڑ گنا زیادہ ہو، تو دوسری

بات ہے، اب اس کے لئے بجز اس کے اور کوئی چارہ کار نہ تھا کہ کام چلانے کے لئے کششِ ثقل
کی رفتار کو لامحدود مانے، اس کے خیال میں اس قسم کے خلل سے ستاروں کی حرکت میں رکاوٹ
ہوتی، اور لاپلاس اس خلل کو اس مفروضہ کی بنا پر دور نہیں کرسکتا تھا، کہ کوئی مزاحمت کرنیوالا
واسطہ موجود ہے، لہذا کششِ ثقل کی محدود رفتار کا تصور ترک کرنا پڑا، گذشتہ چند سال تک خود
اضافیت میں بھی کششِ ثقل کی محدود رفتار کوئی معنی نہیں رکھتی تھی، یہ مفروضہ محض ایک مصنوعی چیز
تھی، جس کا انحصار محددون کے مخصوص انتخاب پر تھا،

مسیر کی حرکت نیچون اور پلوٹو دو نئے سیارون کے انکشاف سے نیوٹن کے قانون کی حیرت انگیز
طور پر تصدیق ہوگئی، مگر یہ قانون ایک اہم امر میں بالکل ناکامیاب رہا، قرص آفتاب سے عطارد
کا عبور ایک دلکش منظر فطرت ہے، قران کے موقع پر ایک سیاہ دھبے کی شکل میں اس سیارے
کو گذرتے ہوئے دیکھا جاسکتا ہے، قرص آفتاب سے اس سیارے کا عبور کچھ وقفوں سے ہوتا
ہے جن کی میعاد تین سے تیرہ سال تک ہے، اس عبور سے اس کی گردش کی مدت معلوم
کیجاتی ہے، اس سلسلہ میں تقریباً تین سو سال سے مشاہدات جمع کئے جارہے ہیں، ان کی
ایک غیر معمولی بات یہ معلوم ہوئی کہ عطارد کا مسیر آہستہ آہستہ ۴۳ ثانیے فی صدی کے حساب سے اپنی
جگہ سے ہٹ رہا ہے، یعنی مسیر کا سب سے قریبی نقطہ جو بعد اقرب کہلاتا ہے، اس رفتار سے آگے بڑھتے
ہوئے اس حد سے دور نکلا جارہا ہے، جہاں تک کہ اسے نیوٹن کے قانون کے مطابق بڑھنا چاہئے، اس
انحراف کو سب سے پہلے لیوریر نے ۱۸۴۵ء میں معلوم کیا، مگر اس نے اس واقعہ کی یہ توجیہ کی کہ سورج
اور عطارد کے مابین کچھ چھوٹے سیارے ہیں، جو اس زائد اثر کا سبب ہیں، لیکن گرہنوں کے
موقع پر جو فوٹو کھینچے گئے ہیں، ان سے ان سیارون کا کوئی پتہ نہیں چلتا، ۱۹۰۱ء کے
سورج گرہن کے موقع پر یہ بات قطعی طور پر تسلیم کرلی گئی تھی، کہ سورج کے نزدیک دکھائی دینے والے

تمام اجسام معلوم کئے جا چکے ہین "اور ۸۰۰۰ اشراق کی روشنی تک کسی سیارے کا وجود نہیں ہو سکتا، اور نہ چھوٹے سیارون کے کسی جھنڈ کے موجود ہونے کا امکان ہے، اگر ایسا ہوتا، تو آسمان ضرور روشن ہو جاتا، لہذا نیوٹن کا قانون کشش ثقل میسر کے بعد اقرب کی سبقت کو ثابت کرنے مین ناکامیاب رہا،

آئن اسٹائن کے اصول موضوعہ

آئن اسٹائن کے نظریۂ اضافیت عام نے عطارد کے بعد اقرب کی سبقت کی توجیہ پیش کی، آئن اسٹائن نے اپنی مساوات کے حاصل کرنے میں نہایت جرأت اور دلیری سے کام لیا، اور اگر گستاخی نہ ہو تو یہ کہا جا سکتا ہے، کہ اوس نے اسکی بنیاد صریحاً ناقابل قبول مفروضات پر رکھی ہے، اور نہایت ہی دقیق اور پیچیدہ عمل ریاضی یعنی احصائے ٹینسر (Tensor Calculus) سے مدد لی ہے، اس فرضیے سے یہ بات تسلیم کرنی پڑتی ہے، کہ روشنی کی رفتار محدود ہے، اور ایک متحرک جسم کی نسبت سے خواہ وہ کتنی ہی تیزی سے حرکت کر رہا ہو، اور خواہ روشنی سامنے سے اس کے قریب آرہی ہو یا عقب سے اس کا پیچھا کر رہی ہو، اسکی رفتار وہی ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سکنڈ رہے گی، ایک ذرہ ب جو ریڈیم سے نکلتا ہے، ایک لاکھ بیس ہزار میل فی سکنڈ کے حساب سے حرکت کر سکتا ہے، لیکن روشنی کی رفتار اس متحرک برقیہ کی نسبت سے بدستور ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سکنڈ ہوگی، خواہ روشنی مخالف سمت سے اس کے قریب آرہی ہو یا اس کا تعاقب کر رہی ہو، مکان و زمان کی مطلقیت کے متعلق نیوٹن کا جو تصور ہے، اس کے مطابق یہ فرضیہ مضحک اور مہمل قرار پاتا ہے، مگر آئن اسٹائن نے جرأت اور دلیری سے کام لیکر اپنے مہتم بالشان نظریہ کی بنیاد اسی عجیب و غریب فرضیہ پر رکھی،

چار امتحان

آئن اسٹائن کا نظریہ چار ابعاد رکھنے والے مکان و زمان کے وجود مسلسل کے فرضی تصور پر مبنی ہے، اس کے سمجھانے مین بہت ہی دقیق اور پیچیدہ ریاضیاتی تحلیل سے کام

لیا گیا ہے، جس کو سمجھنے کا بہت ہی کم لوگون کو موقع مل سکتا ہے، اس نظریہ کی شہرت اس دعوی پر مبنی ہے، کہ اس کے نتائج کی تصدیق چار ورنہ کم سے کم تین فلکی مظاہر کے مشاہدے سے ہو چکی ہے، جو حسب ذیل ہین:-

۱- عطارد کے میسر کی گردش،

۲- سورج کے طیف مین طیفی خطوط کا ہٹنا،

۳- دور کے ستارون سے آنے والی روشنی کا سورج کے پاس سے گذرتے وقت انحراف

۴- کائنات کا انتشار پذیر ہونا،

چوتھے منظر فطرت یعنی انتشار پذیر کائنات کا جہان تک تعلق ہے، آئن اسٹائن نے نہ صرف یہ فرض کر لیا ہے، کہ روشنی کی رفتار کسی متحرک جسم کی نسبت سے خواہ وہ کتنی ہی تیزی سے کسی سمت مین بھی حرکت کر رہا ہو، ہمیشہ یکسان رہتی ہے، بلکہ کشش ثقل کے علاوہ نظریۂ اضافیت کے مطابق کائناتی قوت دفع (Cosmic Force) کو بھی لازمی طور پر تسلیم کرنا پڑتا ہے، اور عجیب و غریب بات یہ کہی ہے کہ اس کائناتی قوت دفع کی شدت دو اجسام کے درمیانی فاصلہ کی نسبت سے بڑھتی بھی جاتی ہے،

اس نظریہ کا رد

آئن اسٹائن کے انتشار پذیر کائنات کے نظریہ کی تائید امریکہ کے ایک عالم ڈاکٹر ہبل نے کی، مگر بعد مین ڈاکٹر موصوف نے خطبات روڈس میں جو اوس نے آکسفورڈ مین دیئے تھے، اس بات کا اعلان کیا، کہ بعد کے مشاہدات سے انتشار پذیر کائنات کے نظریہ کی قطعی تردید ہوگئی،

عطارد کے میسر کی گردش کا جہان تک تعلق ہے، مین نے کئی سال سے اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے، کہ زمان و مکان اور حرکت کے متعلق نیوٹن کے تصورات بالکل صحیح ہین، اور

اسکی مکانک مین صرف اتنی اصلاح کی گنجایش ہے، کہ کشش ثقل کی رفتار کو بجائے لامحدود کے محدود مان لیا جائے، جب اتنی سی اصلاح کر لی گئی، تو سیر عطارد کی گردش کی رفتار بالکل اتنی ہی نکلی جتنی آئن اسٹائن کے نظریہ کے مطابق حاصل ہوتی ہے، اب رہا سورج کے طیف مین طیفی خطوط کا انحراف تو جہان تک قرص شمس سے آنے والی روشنی کا تعلق ہے، میری معلوم کی ہوئی قیمت آئن اسٹائن کی قیمت سے پوری طرح مطابقت رکھتی ہے، اور اسکی تصدیق بھی ہو چکی ہے، روشنی کے طیفی انحراف سے متعلق آئن اسٹائن کی قیمت ہر حالت مین یکسان رہتی ہے، خواہ روشنی قرص آفتاب کے مرکز یا کنارے یا کسی دوسرے حصے سے آرہی ہو، مگر میرے نظریہ کے مطابق اگر ہم مرکز سے کنارے کی طرف چلین تو اس مین رفتہ رفتہ اضافہ ہوتا جائے گا، یہان تک کہ کنارے پر پہونچ کر وہ آئن اسٹائن کے اعداد سے دگنا یعنی سو فی صدی زیادہ ثابت ہوگا،

ڈاکٹر رانڈس نے جن کو حکومت ہند نے ۱۹ رجون ۱۹۳۶ء کے سورج گرہن کے موقع پر جاپان کے شہر ہوکیڈو روانہ کیا تھا، ٹھیک گرہن کے موقع پر سورج کی روشنی کے فوٹو کھینچے، انھون نے جولائی ۱۹۳۷ء مین اپنے نتائج کا اعلان کیا جن سے یہ پتہ چلا کہ طیفی انحراف کے اعداد جو قرص آفتاب کے کنارے کی روشنی مین واقع ہوتا ہے آئن اسٹائن کے اعداد سے ٹھیک دوچند ہین، اس موقع پر مین یہ بھی بتا دون کہ ڈاکٹر رانڈس ہی وہ ہیئت دان ہین جس نے کامل سورج گرہن کے موقع پر روشنی کے طیفی انحراف کا مشاہدہ کیا

انعطاف کا اختلاف

روشنی کا انعطاف نیوٹن کی مکانک کے مطابق ۰ر۸ ثانیہ آتا تھا، اور آئن اسٹائن کے نظریہ کی روسے اسکی زیادہ سے زیادہ قیمت ۱ر۷۵ ثانئے نکلی، یہ نتیجہ تمام ستارون پر عادی سمجھا جاتا ہے، خواہ وہ سورج کے نزدیک ہون یا دور، لیکن میرے نظریہ کے مطابق

روشنی کا انعطاف اس لحاظ سے کہ کسی ستارے کے مشاہدے کا خط سورج سے قریب ہو یا دور ۲ر۳۳، اور ۲ر۶۱ ثانیے کے درمیان ہونا چاہئے،

پروفیسر مکائیلوف نے ۱۹ رجولائی ۱۹۳۶ء کے سورج گرہن کے موقع پر سائبیریا مین سورج کے پیچھے کے ۲۵ ستارون کے فوٹو کھینچے (اس کے مقابلہ مین جاپانی ہیئت دان نے صرف آٹھ کے فوٹو لئے) اور ۱۹۳۷ء مین مزید مشاہدے ہوئے، آخر کار ۱۹۳۹ء مین انکی تحقیقات کا کام مکمل ہوا، انھون نے ازراہ عنایت اپنے نتائج میرے پاس بھیجے ہین جو کہ سائنس کے جرائد مین شائع کئے جا رہے ہین، ان مشاہدات کے چار اعداد ۲ر۷۴، ۲ر۴۲، ۲ر۸۵، اور ۲ر۹۳ ثانیہ ہین جن کا اوسط انحراف ۲ر۷۳ ثانیے نکلتا ہے، پروفیسر مکائیلوف نے غلطی کے احتمال کے لئے ۰ر۱۲ ثانیہ کی گنجایش رکھی ہے، اگر ۰ر۱۲ ثانیے کے احتمالی فرق کو ان کی اوسط قیمت سے منہا کر دیا جائے، تو ۲ر۵۱ ثانئے کا نتیجہ میرے معلوم کردہ اعداد کی حدود کے اندر اور آئن اسٹائن کی بڑی سے بڑی قیمت سے بھی ۵۰ فی صدی زائد ہوتا ہے،

پس ڈاکٹر ہبل، ڈاکٹر رانڈس اور پروفیسر مکائیلوف کے مشاہدات نے آئن اسٹائن کے نظریۂ اضافیت عام کو متردد کر دیا ہے، یہان اور کچھ کہنے کی ضرورت نہین صرف آئن اسٹائن کے ایک قول کا حوالہ دے دینا کافی ہے، اس نے کہا ہے:-

"جو نتائج اس (نظریہ اضافیت) سے اخذ کئے گئے ہین، ان مین سے اگر ایک بھی غلط ثابت ہو تو پورے نظریہ سے ہاتھ دھونا پڑے گا، اس مین ذرا سی ترمیم بھی نہین ہو سکتی جب تک کہ اس کی پوری عمارت مسمار نہ کر دی جائے۔"

اقبال اور برگسان

از مولانا عبدالسلام خان صاحب رامپوری

(۳)

اقبال کے امتیازی عناصر افعال فردہ

متکلمین خصوصًا اشاعرہ ارسطاطالیس کے ہیولیٰ اور صورت کے مقابلہ میں کائنات کی ترکیب اجزاے لایتجزیٰ سے مانتے ہین، متکلمین کے نزدیک یہ اجزار جواہر ہین، اقبال نے کائنات کی توجیہ افعال سے کرنا چاہی ہے، یہ افعال عرض ہین، اس لئے متکلمین کا اجزار لایتجزیٰ کا نظریہ اپنی اصل حیثیت مین اقبال کے نظام مین نہین سماسکتا تھا، اقبال نے ان اجزار کو بجاے جوہر کے عرض قرار دیا، اور جن افعال کی ترکیب سے وہ کائنات کی توجیہ کرتے ہین، ان مین متکلمین کے اجزار لایتجزیٰ یا جواہر فردہ کی تمام صفات مان لین، اشاعرہ کے اجزار لایتجزیٰ کے نظریہ کی حیثیت ایک حد تک مدافعانہ تھی، فلسفۂ یونان کے تتبع ارسطو کی تقلید مین بالعموم کائنات کی توجیہ ہیولیٰ اور صورت سے کرتے تھے، ہیولیٰ اور صورت کو تسلیم کر لینے سے کائنات کی کم از کم نوعی ازلیت اور ابدیت ماننا پڑتی تھی، اور عالم کا ازلی اور ابدی ہونا اصولِ اسلام کے مخالف تھا؟ اشاعرہ نے ہیولیٰ اور صورت کے دلائل پر بہت کڑی نکتہ چینی کی، اور اوس کے جواب مین جواہر فردہ کا تخیل پیش کیا، جو اس قسم کی دشواریون سے پاک تھا، اقبال کے سامنے اس نظریہ کو قبول کرنے کے سابق وجوہ نہ تھے، پھر معلوم نہین انھون نے اس کو کیون اختیار کیا، ممکن ہے کہ اسکی وجہ موجودہ طبیعیات کا نظریہ برقیت ہو جس مین کائنات کی آخری توجیہ برقیون سے کیجاتی ہے، علاوہ ازین برگسان نے کائنات کے اہم حصون، روح

مادہ کی تفریق کے لئے حرکت کی دو متخالف سمتین تسلیم کی ہین، ایک مرکز کے خلاف جانب اور دوسری مرکز کی جانب مرکز کی جانب حرکتِ مادہ اور مرکز کے خلاف جانب روح یا حیات، اس توجیہ سے کائنات مین ثنویت یا دوئی پیدا ہو جاتی ہے، اقبال نے افعالِ فردہ کی ترکیب سے کائنات کو سمجھنے کی کوشش کی ہے، اور افعالِ فردہ کی لطافت اور کثافت سے روح اور مادہ مین فرق کیا ہے، اسلئے ان کا نظام اس ثنویت سے پاک ہے، برگسان کے نزدیک وجدان کی حرکت حیات کی جانب ہے، اور فکر کی مادہ کی طرف، لہذا اوسکو ماننا پڑا کہ عقل و فکر اصل حیات کے علم کا ذریعہ نہیں بن سکتی، اصل حیات کے جاننے کے لئے وجدان ہی ناگزیر ہے، اس طرح فکر و وجدان مین بھی کامل تفرقہ پیدا ہو گیا، مگر اقبال کے افعالِ فردہ کے نظریہ مین یہ خامی نہین، برگسان کے نظریہ کا لازمی نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ ہمارے فکری علوم اور حسیاتی مشاہدات اور طبعیاتی تجربے خلافِ واقعہ اور محض دھوکا ٹھہرین، لیکن اقبال کے خیال کے مطابق ان کو نفس الامر اور حقیقت کے خلاف نہیں کہا جا سکے گا،

ارادہ

برگسان کے نزدیک کائنات افعال کا تسلسل ہے، اس کا مرکز خود بھی سلسلہ ہے فعلیت کا، یعنی یہ منبع یا مرکز اپنی ذاتی حیثیت سے مرکز نہیں، اوس کو مرکز محض اس وجہ سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ حرکت کی روانی کی سمت کے خلاف ہے، اور حرکت اسکی سمت سے آگے کو بڑھ رہی ہے، کائنات اور اوس کے مرکز کے اس تصور کے ماتحت کسی ذات کا وجود نہیں ہو سکتا، کیونکہ ذات مین کسی نہ کسی حیثیت سے مرکزیت یا کوئی اجتماعی اعتبار ضروری ہے، خواہ یہ اعتباری اجتماع محض من حیث الکل اور من حیث المجموع ہی کیون نہ ہو، بہرحال ذات کے تصور کے لئے اجتماعیت واقعی خواہ اعتباری ضروری ہے، لیکن برگسان کے نزدیک فعلیت مسترہ یا سلسلہ افعال مین اس قسم کی اجتماعیت ممکن نہیں، برگسان کے نزدیک فعلیتِ مطلقہ مین نہ ظہور و بطون کے اعتبار سے فرق ہے اور نہ قوت و فعل کے اعتبار سے، فعلیتِ مطلقہ کا وجود صرف اپنی فعلی حیثیت مین ہے، اور وہ بھی

اس حد تک جس حد تک اوس کا خروج ہو چکا ہے لیکن یہ خروج کہین ٹھہرتا نہین، بلکہ وہ فعلیت مسلسل آگے بڑھتی جارہی ہے، یا دوسرے لفظون مین افعال کو پیدا کرتی جارہی ہے، ان افعال کا وجود کسی پہلے سے قائم کئے ہوئے یا کسی موجود تصور پر مبنی نہین، یہ خلق بالکل آزاد ہے، اس کے وجود کی علت ضرورتِ آفرینش ہے، اور بس، فعلیتِ مطلقہ مین محض اس بات کا شعور ہے، کہ اس سے فعل سرزد ہو رہا ہے، کوئی فعل خاص اپنے وجود مین آنے سے پہلے کسی قسم کا ثبوت نہین رکھتا، اسلئے اس کے خلق یا ظہور سے پہلے اوس کے علم کے بھی کوئی معنی نہین، یہ افعال ابتدائی اور بلا کسی پہلے سے قائم کئے ہوئے تصور کی بنا پر ہین، اس لئے اس خلق مین ارادہ کو کوئی دخل نہین ہوسکتا، کیونکہ ارادہ کے لئے کم از کم کسی جانب کے اختیار اور ترجیح کے حق کا شعور ضروری ہے، اور اختیار و ترجیح کے حق کے شعور کے لئے اوس شے یا فعل کا تصور جو سرزد ہو رہا ہے، صدور سے پہلے ضروری ہے، بلا اس تصور کے ارادہ کے کوئی معنی نہین،

برگسان کا یہ نظریۂ خلق جس مین خلاقِ فعلیت افعال کے ظہور سے پہلے ان کے علم سے بے بہرہ ہو، اور ان کی آفرینش مین اس خلاقِ فعلیت کے ارادہ اور مشیت کو کوئی دخل نہ ہو، اسلامی الہیات کے خلاف ہے، اسلام مین خلق اور مشیت و ارادہ لازم و ملزوم ہین، اقبال نے اس خلاقِ فعلیت مین شعور کے ساتھ ارادہ اور مشیت کو شامل کر دیا ہے، اقبال کے نزدیک یہ فعلیت مطلقہ جس سے افعال کا ظہور ہو رہا ہے، باشعور اور با ارادہ ہے، اگر محض سلسلہ افعال کو خلاقِ فعلیت فرض کر لیا جائے، جیسا کہ برگسان کے فلسفہ کا حاصل ہے، تو ارادہ اور مشیت کے کوئی معنی نہ ہونگے، ارادہ کے لئے کسی نہ کسی قسم کی مرکزیت کا اعتبار کرنا ضروری ہے، تا کہ افعال اور اوس کے منبع مین غیریت پیدا ہو جائے، اور اوس مرکز کے ارادے کے تحت افعال کا ظہور ہو، علاوہ ازین یہ سلسلہ افعال غیر منقطع ہے، لہذا فعلیتِ مطلقہ کی ذات ہمیشہ ناتمام رہے گی، یہ تصور خلاقِ فعلیت کے

اسلامی تصور کے منافی ہے، ان ہی دشواریون کی وجہ سے اقبال نے خلاقِ فعلیت کو سلسلۂ افعال سے علحدہ کر دیا ہے، خلاقِ فعلیت مین مرکزیت اور اجتماعیت پیدا ہو گئی، یہ خلاقِ فعلیت با ارادہ اور باشعور ہے جس سے افعال کا صدور ہو رہا ہے،

اقبال اس خلق کو برگسان کی پیروی مین آزاد مانتے ہین، لیکن ارادہ کے ماتحت محض خلق (بشرطیکہ اسکو مخلوق سے الگ مانا جائے، جو اقبال کے خیال کے خلاف ہے) ہی آزاد ہو سکتی ہے، خود فعل آزاد نہیں ہو سکتا، برگسان کے نزدیک خود فعل آزاد ہے، کوئی فعل اس وجہ سے سرزد نہیں ہوتا کہ اس فعل کو ہی سرزد کرنا تھا، وہ خود بخود ضرورتِ آفرینش کے ماتحت صادر ہوتا ہے، فعل کے ارادی خلق کے معنی یہ ہین، کہ اوس کو ترجیح دے دی گئی ہے، اور بصورتِ ترجیح اوس فعل کا ظہور خود بخود نہ ہوگا، بلکہ اس کا اپنی مخصوص حیثیت مین ہونا کسی نہ کسی حد تک جبری ہوگا، فعلیتِ مطلقہ خواہ اپنے اظہار مین آزاد ہو، مگر افعال آزاد نہ ہونگے، اگرچہ اقبال نے خلاقِ فعلیت کا جو تصور پیش کیا ہے، اسکے مطابق خلاق فعلیت کی آزادی بھی مشتبہ ہو جاتی ہے،

مقصدیت | پہلے گذر چکا ہے کہ برگسان کے نزدیک کائنات آزاد سلسلہ افعال ہے، اسلئے بے مقصد اور بے غایت ہے، اقبال نے برگسان کے اس خیال کی تردید کی ہے، جس کی وجہ یہی ہے کہ کائنات کا ایسا تصور اسلامی تعلیم کے موافق نہین، اقبال کائنات کو با مقصد کہتے ہین، کائنات کا مقصد ارتقائی مظاہرۂ حیات ہے، مزید بران افعال کے ظہور سے خود بخود کوئی نہ کوئی مقصد متعین ہو جاتا ہے، استقبال کے امکانات، ماضی کی یادداشتین اور حالیہ افعال باہم ملکر کوئی سمت خود مقرر کر لیتے ہین، اشیاء و افعال کا رُخ اس سمت کی طرف خود بخود پھر جاتا ہے،

برگسان افعال کو آزاد مانتا ہے، اسلئے ظاہر ہے کہ خلق کا پہلے سے سوچا ہوا کوئی مقصد نہیں ہو سکتا، ورنہ افعال کا وجود خواہ مخواہ اسی سمت ہی ہوگا اور ان کی آزادی اور خود بخود ہونا ختم ہو جائے گا، محض

ارتقائی نظام ہے، کا اوس کو بھی انکار نہین کیونکہ تخلیقی ارتقاء کے نظریہ کا وہ بانی ہی ہے، اقبال کے آزاد وجود کے بعد ان کی کسی سمت کا متعین ہو جانا، اور اس طرح خود بخود کسی خاص نظم کا [illegible] ہو جانا اوس کے خیالات کی عام رو کے خلاف نہین،

اقبال اور برگسان مین زیادہ سے زیادہ یہ فرق ہو سکتا ہے کہ اقبال خلق کو ارادہ کے ماتحت تسلیم کرتے ہین، اس لئے ارتقائی اظہارِ حیات بحیثیت مقصد کے فعلیتِ مطلقہ کا منشا ہے اور برگسان کے نزدیک یہ ارتقائی اظہار خود بخود بلا ارادہ ہے، یعنی عالم مین ارتقائی تخلیق ہے، اور محض اس لیے کہ ہے، اقبال کے نزدیک بھی ارتقائی تخلیق ہے، مگر اس لئے کہ یہی فعلیتِ مطلقہ کا مقصد اور منشا ہے، حقیقت یہ ہو کہ فعلیتِ مطلقہ مین شعور کے ساتھ ارادہ کو مان لینے سے اقبال اور برگسان کے خیالات مین کافی فرق ہو گیا ہے، یہ فرق ناگزیر بھی ہے، اور بہت سی ایسی دشواریون کا باعث جن سے برگسان کا نظام پاک ہے،

اجمالی استمرار اقبال زمانہ کے دو مصداق مانتے ہین، ظاہری اور باطنی، اقبال اور برگسان مین اس حد تک اتفاق ہے، کہ دونون زمانہ کے عام تصور کو غیر حقیقی زمان کہتے ہین، اور اصل زمان کو اس مکانی زمان سے بالکل علحدہ تسلیم کرتے ہین، یہ اصلی زمانہ تخلیق اور تاثیر ہے، اس مین ماضی زمانہ حال یا استقبال سے علحدہ نہین، بلکہ ماضی زمانہ حال اور استقبال کے ساتھ ساتھ ہوتا ہے، لیکن حقیقی زمانہ کے تصور مین دونون مختلف ہین، برگسان کے نزدیک اصلی زمانہ کا تعلق استمرار اور فعلیت کے تسلسل سے اور تواتر سے ہے، اور اقبال کے نزدیک اوس کا تعلق ذات کی عضوی کیفیت سے ہے،

اقبال کے نزدیک حقیقی زمانہ جس کو وہ استمرار سے تعبیر کرتے ہین، فعلیتِ مطلقہ مین شعور کے ساتھ متداخل ہے، یہ استمرار ایک قدیم اصطلاح کے مطابق اجمال ہے جس کی ماضی حال اور مستقبل اجمالی طور پر اسی استمرار مین موجود ہین، چنانچہ عالم کون و فساد مین بھی استمرار ماضی حال اور مستقبل

مین کھلتا جاتا ہے، اس اندرونی استمرار کی ایک "اب" بیرونی عالم مین "اب" کی کثیر تعداد مین کھلتا جاتا ہے، یہ اندرونی "اب" عالم خارجی کے اعتبار سے ہزارون سال ہو سکتا ہے، اسمین کوئی تدریج اور تعاقب نہین ہوتا، یہ اندرونی استمرار عالم خارجی مین اپنے تمام واقعات کے ساتھ ظہور پذیر ہوتا ہے، جو اقبال کے نزدیک خلق ہے، اقبال کے نزدیک یہی استمرار تقدیر ہے، جس مین پوری کائنات اپنی ذاتی صلاحیتون اور امکانات کے طور پر محفوظ ہے، برگسان کا "استمرار" تخلیق محض ہو جو آزاد ہے، اوس کے نزدیک امکانات اور صلاحیتوں کا کوئی اعتبار نہین، وہ استمرار کو بالفعل تخلیقی تواتر مانتا ہے، اقبال کے نزدیک حقیقی استمرار جو خلاق اور موثر ہے، ایک بالقوہ تاثیر اور تخلیق ہے، اسلئے اسمین ماضی حال اور مستقبل باہم تحلیل ہیں،

زمانہ اور استمرار کے عام ذہنی تصور مین تسلسل اور تواتر ہے، خواہ وہ مکانی نقطون کے اعتبار سے ہو، خواہ خلق کے اعتبار سے، لیکن اقبال کے حقیقی استمرار کے تصور مین تواتر اور تسلسل کی حقیقت مفقود ہے، اس کا حقیقی استمرار ایک بسیط کلیت ہے، جو اپنی ذات کے اعتبار سے ایک قسم کی انجمادی حیثیت رکھتا ہے، اوس کا تسلسل اور تواتر اپنے ظہور اور کھلنے کے اعتبار سے ہے،

اقبال کے نزدیک اس استمرار کا "اب" عالم خارجی کے ہزار ہا سال کا ہو سکتا ہے، اگرچہ اقبال نے اپنے اس خیال کی بہت توضیح کی ہے، اور اسکو مثال سے واضح کرنے کی کوشش کی ہے پھر بھی یہ نظریہ مزید وضاحت کا محتاج ہے، کیونکہ زمانہ کے عام مفہوم یعنی تواتر اور تسلسل سے قطع نظر بھی کر لیجائے، اور اس کو بالقوہ کی حیثیت مین تصور کیا جائے، تو وہ محض ایک بسیط ناقابلِ تجزی شے رہے گا، اور اسکی یہ بالقوہ حیثیت عالم خارجی کے پورے فعلی رُخ کو یعنی اوسکی لامحدود ازلیت اور ابدیت کو حاوی ہو جائے گی، اس صورت مین زیادہ سے زیادہ زبان کی دشواریون کو پیش نظر رکھکر یہی کیا جا سکتا ہے، کہ اوسکی "اب" (اور وہ اپنی بالقوہ حیثیت مین محض ایک "اب" ہی ہو سکتا ہے) عالم خارجی کی لامحدود ازلیت اور ابدیت، دونون کو حاوی ہے اسکی ایک "اب"

کو صرف ہزارہا سال پر حاوی ماننے کے کوئی معنی نہ ہون گے، اقبال نے سُرخ رنگ سے جس کے احساس کی وجہ تموجات کی غیر معمولی سرعت ہے، یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے، کہ ایک شے کے احساس کے لئے قلیل ترین وقت کافی ہوتا ہے، مگر اوسکی تفصیل کے لئے ہزارون سال درکار ہوتے ہین، اقبال کی یہ مثال قابلِ غور ہے سُرخ رنگ نام ہے ایک مخصوص احساس کا، واقعیتی نقطۂ نظر سے یہ احساس واقعی ہے، جس کو پیدا کرنے والے انتہائی سریع تموجات ہین، یہ تموجات خود بھی واقعی ہین، زیادہ سے زیادہ ایک واقعی کثرت نے ایک بسیط احساس پیدا کیا، دوسرے لفظوں مین ایک کثرت نے وحدت پیدا کی، اور یہ وحدت یا یہ بسیط احساس کسی طرح بھی نہ کثرت مین تحلیل کیا جا سکتا ہے اور نہ کثرت مین اپنے آپ کو ظاہر کر سکتا ہے، یہ احساس جو کثیر افعال کا اثر ہے، خود واحد ہے اور واحد ہی رہے گا، نہ یہ کثیر افعال سے مرکب ہے، اور نہ کثیر افعال مین منقسم،

اقبال اس استمرار کو جو فعلیتِ مطلقہ کی ذات مین مع ماضی اور مستقبل کے واقعات کے بسیط طور پر محفوظ ہے، تقدیر کہتے ہین، یہ تقدیر خارج سے مسلط کی ہوئی قسمت نہین، بلکہ اشیاء کی اندرونی رسائی کی حد ہے، خود افعال اور اشیاء آزاد ہین،

برگسان افعال کو آزاد اور خود بخود مانتا ہے، اوس کے نزدیک پہلے سے نہ خود ان کی کسی خاص صلاحیت اور امکان کے وجود کی ضرورت ہے، اور نہ کسی دوسرے کے ارادے کی، اقبال فعلیتِ مطلقہ کی ذات مین ان افعال اور اشیاء کے امکانات محفوظ مانتے ہین، اور ان کا ظہور ذاتِ مطلقہ کے ارادے کے ماتحت تسلیم کرتے ہین،

یہ امکانات ان معنی مین امکانات نہین ہین، کہ ان کی وجودی اور عدمی دونون جانبیں بالکل مساوی ہون، بظاہر اقبال کی مراد امکانات سے خصوصی رجحانات اور استعدادات ہین، اگر امکانات کے پہلے معنی ہی مراد ہون، تو فعلیتِ مطلقہ کا ارادہ کسی خاص جانب کو ترجیح دے دیگا، بہرحال

ان افعال کا صدور مخصوص حیثیت مین اور مخصوص اندرونی صلاحیتون اور میلانون کے ساتھ ہوگا، یہ میلانات اتنے صحیح ہون گے، کہ واقعہ ان کے خلاف نہ ہو سکے گا، مزید بران یہ صلاحیتیں اور رجحانات حقیقۂ فعلیتِ مطلقہ کے ذاتی رجحانات اور صلاحیتیں ہونگی، جو اوس کے بالقوہ افعال کی حیثیت مین اوس مین خود بخود موجود ہین، ذاتِ مطلقہ نے ارادے سے اون افعال کو ظاہر کیا ہے، ایسی صورت مین تقدیر کو افعال اور اشیاء کی ذات کی خالص اندرونی رسائی ماننا، اور ان کی حقیقی آزادی تسلیم کرنا بہت دشوار ہوگا، زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے، کہ افعال و اشیاء کی آزادی کے معنی فقط اتنے ہین، کہ افعال و اشیاء کو یہ شعور ہو کہ وہ اپنے افعال مین آزاد ہین، اگرچہ ان کا یہ شعور حقیقت مین واقعہ کے خلاف ہی کیون نہ ہو،

اندرون قعرِ دریا تختہ بندم کردہٴ باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

اسلام اور اکثر دوسرے مذاہب مین یہ عقیدہ تسلیم کیا گیا ہے، کہ ہر چیز کا تعلق خواہ وہ خیر ہو خواہ شر خدا کی مشیت سے ہے، تقدیر کا یہ نظریہ مسلمان علماء مین ہمیشہ سے محلِ غور و فکر رہا ہے، یہ عقیدہ درحقیقت ارادی خلق کے لوازم مین سے ہے، ارادی خلق کو تسلیم کرکے اس دشواری سے بچ نکلنا بہت مشکل ہے، خود اقبال ایک متکلم ہونے کی حیثیت سے ارادی خلق تسلیم کرنے پر مجبور تھے، تقدیر اوس کے ناگزیر لوازم مین سے ہونیکے ساتھ ساتھ اسلام مین منصوص حیثیت رکھتی ہے، برگسان کے استمرار مین اسکی کوئی گنجایش نہ تھی، لہذا اقبال کو استمرار مرتبہ ذات مین ایک اجمالی کلیت فرض کرنا پڑا،

اسلامی الٰہیات کا بیان ہے کہ خدا کے دن کی مقدار انسانی اوقات کے پیمانہ کے اعتبار سے ہزار سال ہے، علماء نے اسکی بہت سی توجیہیں اور مختلف معنی بیان کئے ہین، بہرحال اس کا ظاہری مفہوم ہمارے معیارِ اوقات سے کسی طرح مطابق نہیں ہو سکتا تھا، برگسان نے حقیقی زمانہ یا استمرار کا جو تصور پیش کیا ہے، اس مین بھی اس دشواری کے حل کا کوئی سامان نہیں، اقبال نے غالبًا اسی دشواری کو حل کرنے کے لئے یہ تسلیم کیا کہ حقیقی زمانہ یا استمرار اپنی اندرونی ذات کے اعتبار سے اس نوعیت کا

کہ اوس کا ایک "اب" عالم خارجی کے اعتبار سے ہزارون سال ہو سکتا ہے،

علم اجمالی

اقبال اور برگسان دونون عقل و فکر کو کاروباری ملکہ کہتے ہین، یہ ملکہ اشیا، اور افعال کو انکی مکانی اور تدریجی حیثیت مین جاننے کی کوشش کرتا ہے، اوس کا تعلق جامد اشیا ہین جن میں سے حقیقی موثر اور حیاتیاتی حرکت خارج ہو جاتی ہے، برگسان اسی ملکہ کے معلومات کو غیر حقیقی اور خلافِ واقعہ جانتا ہے، اقبال کے نزدیک علم کا کاروباری رُخ بھی حقیقت اور واقعہ ہے اسلئے اس کو خلاف واقعہ نہین کہا جاسکتا، اگرچہ برگسان کے نزدیک بھی یہ خلافِ واقعہ محض اس اعتبار سے ہے، کہ واقعیت ایک مستمر کلیت ہے اور عقل و فکر کا متعلق مستمر کلیت نہین، بلکہ حقیقت کے بعض پہلو ہین، جن کو عقل و فکر نے اپنی ساخت کی خصوصیت کی وجہ سے جامد اور ساکن کر لیا ہے،

اقبال کے نزدیک علم فکری کے معلومات بھی حقیقی ہین، اس لئے ان پر برٹرانڈ رسل کا وہ مشہور اعتراض نہیں ہوتا، جو اوس نے برگسان پر کیا ہے، کہ "باوجودیکہ برگسان کے نزدیک فکری علم غیر حقیقی علم اور خالص عملی ملکہ ہے، جس کا نشو و نما تنازع للبقا کے اصول پر ہوا ہے، حالانکہ یہ نظریہ خود علم فکری اور اوس کے اصول پر مبنی ہے" علاوہ ازین اپنے نظریون کو ثابت کرنے اور دوسرے نظریون کو باطل کرنے کے لئے اوس نے بھی فکری دلائل سے ہی کام لیا ہے،

اقبال نے فعلیتِ مطلقہ کو اسکی ذاتی حیثیت مین ایک قسم کا اجمال مانا ہے، جس کو وہ "خدا" کہتے ہین، خدا کے اسلامی تصور مین ایسا محیط کل علم شامل ہے، جس سے عالم کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا ذرہ بھی باہر نہیں، اس علم الٰہی مین ماضی، حال اور مستقبل کی کوئی خصوصیت نہیں، برگسان نے فعلیتِ مطلقہ مین شعور مانا ہے، اس کی شعور سے مراد جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، یہ ہے، کہ فعلیتِ مطلقہ کو علم ہے، کہ اس سے افعال سرزد ہو رہے ہیں، برگسان کے نزدیک ماضی فعلیت کے تسلسل اور تواتر کے ساتھ ساتھ کھنچتا چلا آتا ہے، لہذا اس کے نزدیک

شعور بھی جانبِ ماضی سے استقبال تک کھنچتا رہے گا، ماضی کا شعور اوس کے خیال کے مطابق ساتھ ساتھ رہتا ہے، لیکن ہمارا تفکر جو کاروباری زندگی سے متعلق ہے، ماضی کے ان شعورون کو روک دیتا ہے، اور ان کے تسلسل کو قطع کر دیتا ہے، جن کا ہمارے موجودہ کاروباری مقاصد سے علاقہ نہ ہو، بہرحال برگسان کے اصول کے مطابق علم کا تعلق ماضی سے تو ہو سکتا ہے لیکن مستقبل جس طرح غیر موجود ہے اسی طرح غیر معلوم بھی رہے گا،

اقبال نے علم باری کی اس اسلامی خصوصیت کی وجہ سے فعلیتِ مطلقہ کے مرتبۂ ذات مین ایک بسیط علم کو شامل کیا، یہ بسیط علم مرتبۂ ذات مین ایک اجمال ہے، جو استمرار کی طرح ماضی حال اور مستقبل کے تمام لامحدود افعال اور اشیا پر حاوی ہے، لوحِ محفوظ کا اسی اجمالی اور محیط کل علم کو تعبیر کیا گیا ہے،

ذات باری

کائنات یا سلسلۂ افعال کا ظہور برگسان کے نزدیک غیر ذی روح مادہ کی تحلیل اور ترکیب اور اسکے ارتقار کا معلول نہین، بلکہ ایک مجہول الکنہ، با حیات فعلیت اسکی علت ہے اگر کائنات اور مخلوق کے علاوہ کسی مکوّن اور خالق کا وجود ضروری ہو، تو برگسان کے نظام مین وہی مجہول الکنہ حیاتیاتی فعلیت ہو سکتی ہے، کیونکہ برگسان کے نظام مین اس کے علاوہ کسی اور شے کا وجود نہین، لیکن فعلیتِ مطلقہ کا یہ برگسانی تصور ان تمام صفات سے عاری ہے، جن کو تمام مذاہب نے بالعموم خدا مین تسلیم کیا ہے، فعلیتِ مطلقہ کے اس تصور میں نہ ارادہ ہے اور نہ محیطِ کل علم اور اسکی مخلوق کا ظہور خود بخود اور بلا مقصد ہے، ہر چیز ضرورتِ آفرینش کی بنا پر ظاہر ہوتی ہے، اس کے علاوہ اپنا کوئی مقصد نہین رکھتی،

اقبال نے برگسان کی فعلیتِ مطلقہ کے اس نقص کو پیش نظر رکھتے ہوئے فعلیتِ مطلقہ کے اُن تمام نقصوں کی تکمیل کی، جن سے ذاتِ باری کے تصور کو برتر ہونا چاہیئے، اور اس مین دو اعتبار فرض کئے، ایک تفصیلی اور دوسرا اجمالی، فعلیتِ مطلقہ کے اجمالی اعتبار کو ذاتِ باری

اور تفصیلی اعتبار کو کائنات قرار دیا، اقبال کے نظام مین فعلیتِ مطلقہ کے اجمالی اعتبار مین ارادہ، محیط کل علم اور اجمالی استمرار سب ملکر ایک عضوی وحدت بناتے ہین، جس کو "خدا" یا "انا مطلق" کہا جاسکتا ہے، یہ ذات اون تمام صفات کی حامل ہے جن کو اسلام نے ذاتِ باری مین تسلیم کیا ہے، خلق اور ارادہ سے قادریتِ مطلقہ خود بخود پیدا ہو جاتی ہے، علم مین سمع وبصر وغیرہ صفات داخل ہین،

وحدتِ وجود

برگسان کے نزدیک کائنات مسلسل فعلیت ہے، یہ مسلسل فعلیت اور متواتر حرکت مختلف سمتون مین جاری ہے، ان سمتوں مین سے بعض مین نوعی فرق ہے، جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے کہ حیات اور مادے کی حرکتین ایک دوسرے کے متعاکس ہین، بعض اگرچہ نوعی طور پر متخالف نہین ہین لیکن ان کی سمتین پھر بھی منتشر ہین، یہ متواتر اور مسلسل افعال اس اعتبار سے متحد ہین، کہ یہ سب حرکتین ہین، جن مین ایک ہی مجہول الکنہ حیات جاری ہے، لیکن شخصی طور پر سب علٰحدہ علٰحدہ ہین، کائنات کی کثرت اور رنگا رنگی کی وجہ ان حرکات کا یہی اختلاف اور انتشار ہے، کائنات اگرچہ جنسی طور پر ایک وحدت ہے، لیکن نوعی، صنفی اور شخصی طور پر یہ ایک کثرت ہے، جو ایک سلسلہ میں بلا انقطاع رواں اور دواں ہے، گویا یہ افعال اوس سلسلۂ فعلیت وحرکت کے ناقابل انفکاک اجزاء ہین، اور وہ ایک قسم کا عضوی کل، اقبال نے کائنات اور اوس کے خالق کا جو تصور پیش کیا ہے، اس کے اعتبار سے بھی اگرچہ افعال مین کثرت اور اختلاف ہے، لیکن یہ افعال اوس فعلیتِ مطلقہ کے اجزاء نہیں ہین، بلکہ یہ فعلیتِ مطلقہ کی تفصیل ہین، فعلیتِ مطلقہ اپنی اجمالی حیثیت مین خالق اور تفصیلی حیثیت مین کائنات، کائنات اوسی فعلیتِ مطلقہ کا ظہوری اعتبار ہے، اقبال اپنے اس تصور کی بنا پر پرانی اصطلاح کے مطابق شیخ المتصوفین ابن عربی کے نظریۂ "لاموجود الا ہو" کے حامی ہین، ان کے نزدیک عالم مین بجز "انا کامل" یا فعلیتِ مطلقہ کے کسی چیز کا وجود

حقیقی نہیں، اون کے نظام مین اس معنی مین "ہمہ اوست" یا "ہو الکل" کے مرادف "وحدۃ الوجود" کی کوئی گنجایش نہین، کہ کائنات اپنی حقیقی حیثیت مین خدا ہے،

"وحدۃ الوجود" کا مسئلہ قدیم زمانہ سے غور وفکر کا مرکز رہا ہے، خود اسلام مین بھی ابن عربی کے دور سے یہ ایک خالص علمی حیثیت اختیار کئے ہوئے ہے، چنانچہ مسلم علماء اور متصوفین دونون نے عقلی اور نقلی ہر نقطۂ نظر سے اس پر موافقانہ اور مخالفانہ غور کیا ہے، جس کا سلسلہ اب تک ختم نہین ہوا ہے، لہذا مین اوسکو نظر انداز کرتا ہون،

اقبال کی الٰہیات پر اجمالی نظر

برگسان کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ اقبال کے مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے، کہ ان دونون کے فلسفیانہ نظام تصوری ہین، ان مین سے موخر الذکر کے نظام مین متصوفانہ عنصر زیادہ شامل ہے، اقبال کے نظام مین جو انفرادی نقطے ہین، ان مین سے اکثر کا اضافہ نظام کی عقلی تکمیل کے لئے نہیں ہے، بلکہ ان کو محض مذہبی تصورات کی اساس بنانے کے لئے زیادہ کیا گیا ہے، اقبال اور برگسان کے بنیادی فرق کے لئے یہ کہا جاسکتا ہے، کہ اقبال کے نظام مین ایک اجمالی اعتبار کی زیادتی ہے، جو برگسان کے یہان نہیں، برگسان کے تصور کائنات سے ایک بسیط تجریدی اعتبار کا انتزاع کر لیا ہے، اور اس میں برگسانی تصور کی اجمالی حیثیت مین تمام خصوصیتیں اور اون کے علاوہ بعض دوسری خصوصیتیں بھی فرض کر لی گئی ہین اس اجمال اور تفصیل مین قدیم اصطلاح کے مطابق "ظہور وکمون" کے اعتبار سے فرق ہے،

ہر فلسفہ مین یہ چیز لازمی ہے، کہ اوس کے اصول ہم آہنگ ہون، لیکن اقبال نے اپنے نظام کو جن اجزاء سے مرکب کیا ہے، آپس مین پوری طرح ہم آہنگ نہین معلوم ہوتے، مثلاً ارادی خلق کے ساتھ کائنات کی آزادی، زمانہ، اور اوس کا تسلسل سے خلو، فعلیتِ مطلقہ یا "انا کامل" کا غیر محدود صلاحیتون پر مشتمل ہوتے ہوئے ان کا تدریجی ظہور، اس کے ساتھ ساتھ تقدیر کو افعال کی ذاتی اور

آزاد ورسائی کا منتہی تسلیم کرنا ایسی چیزین ہین جن مین بظاہر تضاد معلوم ہوتا ہے،

حقیقت یہ ہے کہ ہمارا ہر فلسفہ بلکہ ہماری عقلی موشگافیون کا ہر نتیجہ وَمَا اُوتِیتُم مِنَ العِلمِ اِلَّا قَلِیلًا کی ابدی صداقت کی ایک مزید شہادت فراہم کردیتا ہے اور بس، کائنات کا معمہ جس طرح ابتدائے آفرینش کے وقت لاینحل تھا، اسی طرح آج دورِ عقلیت مین بھی لاینحل ہے، اور غالبًا رہے گا،

کتابیات

زیرِ نظر مقالہ مین حسب ذیل کتابین خصوصیت سے سامنے رہی ہین، اقبال کے خیالات ان کے اشعار اور "اسلامی تصورات کی تعمیرِ نو پر خطبات" سے ماخوذ ہین، برگسان کے خیالات کا تقریبًا کل حصہ اسکی کتاب "تخلیقِ ارتقا" سے ماخوذ ہے، عقل وفکر کی خصوصیات کے متعلق ایک یا دو اقتباس اسکی کتاب "مقدمہ مابعد الطبعیات" سے لئے گئے ہین، برگسان کے خیالات کی تشریح اور تجزیہ وغیرہ مین فلسفۂ جدید کی تاریخون سے مدد لی گئی ہے، ابن عربی کے نظریۂ "وحدتِ وجود" اور متکلمین کے "زمان ومکان" کا تذکرہ ضمنًا آگیا ہے، ان کے لئے قاضی عضد الدین کی المواقف مع شرح میر سید شریف اور ابن عربی کی "فصوص الحکم" مع شرح نابلسی سے استفادہ کیا ہے، کانٹ کا نظریۂ "زمان ومکان" اس کی "انتقادِ عقلِ خالص" سے ماخوذ ہے، فشٹے کی اپنی تصنیف مجھے نہین مل سکی، چنانچہ "انا" کے متعلق اسکندر کی "تاریخ فلسفۂ جدید" باب موضوعی تصوریت، بیان "فشٹے" کو سامنے رکھنا پڑا "انتقادی فلسفہ اور علم" ہانڈنگ کی "تاریخ فلسفۂ جدید" سے ماخوذ ہے، کائنات کی اصل کے متعلق جدید نظریۂ برقیت جیمس جینس کی کتاب "پراسرار کائنات" سے لیا گیا ہے، تصوف کی عام خصوصیت اور برگسان پر انتقاد برٹرانڈرسل کے مقالہ "تصوف اور منطق" سے اقتباس کیا گیا ہے،

1- Creative Evolution PP 1-5, 11, 28-30, 48, 94,

by H. Bergson. 103, 104, 106, 107, 162, 252, 265, 287, 314, 356, 358, 359.

2. Six lectures on the Reconstruction of Religious Thought in Islam, by Dr. Iqbal PP. 3, 7-9, 13, 15, 17, 18, 47, 66, 67, 68-79, 87, 90, 93, 95, 96, 100, 106, 107, 137, 140, 159, 197, 230, 249.

۳- مقدمہ مابعد الطبعیات از ہنری برگسان (دار الترجمہ حیدرآباد)

4. Guide to Philosophy PP. 178, 180. 415. 440. 556. by C. E. M. Joad.

5 Critique of pure Reason PP 67-82. by Kant. (Macmillan 1933)

۶- المواقف از قاضی عضد الدین الایجی مع شرح از میر سید شریف جرجانی مطبوعہ نولکشور، بحث مکان ص ۸۰،۲، بحثِ زمان ص ۲۶۴ و ۲۶۶-

فصوص الحکم از ابن عربی، مع شرح از عبد الغنی نابلسی مطبوعہ مصر جلد اول حکمتِ ادریسیہ ص ۱۳۰ و ۱۳۳ و ۱۳۶-۱۳۷، حکمت اسماعیلیہ ص ۱۹۲-۱۹۵، جلد دوم حکمت یوسفیہ ص ۲۶-۲۹،

8. The Mysterious Universe by Sir James Jeans. P. P. 61-99 (Chapter III, Matter & Radiation).

9. Bertrand Russel's Essey on Mysticism & Logic.

۱۰- تاریخ فلسفہ جدید از ہافڈنگ (دار الترجمہ حیدرآباد) تمہید کتاب چہارم،

11. A short History of Philosophy by Alexander. P. P. 594-600, 413-423.

12. History of Modern Philosophy by A. W. Benn. P. P. 127. 129.

13. Story of Philosophy by W. Durant Ph. D. P. P. 490-507.

ابن خلدون

مترجم مولانا عبدالسلام ندوی

مصری یونیورسٹی کے مشہور پروفیسر ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے ڈاکٹریٹ کے ڈگری کے لئے ابن خلدون اور اسکے فلسفہ اجتماعی پر فرنچ زبان مین ایک مقالہ لکھا تھا، جس کا ترجمہ انہی کے ایما سے محمد عبد اللہ نے عربی مین کیا، اب اوس عربی ترجمہ کا اردو ترجمہ مولانا عبد السلام ندوی نے نہایت خوبی کر کیا ہے، یہ کتاب درحقیقت ہماری زبان مین اجتماعیات پر ایک بہترین اضافہ ہے، اور بالکل پہلی مرتبہ ابن خلدون کے نظریہ اجتماعی کو اس وسعت اور تفصیل کے پیش کیا گیا ہے،

ضخامت:- ۲۶۰ صفحے، قیمت :- عیر

"منیجر"

تلخیص و تبصرہ

مورو قوم مین اسلام کی تاریخ

"مسلم ورلڈ جنوری ۱۹۴۱ء؁ مین مسٹر کلاڈ ڈال ڈکنس (Claudel Dickens) نے مندرجہ بالا عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے جس سے مورو قوم مین اسلام کی تاریخ پر روشنی پڑتی ہے، اسلئے اسکی تلخیص ذیل مین درج کیجاتی ہے"

جزیرہ سولو مین یہ افسانہ بہت زمانہ سے مشہور ہے، کہ پہلا انسان جس نے اس سرزمین پر قدم رکھا، وہ جی یون کولیسا اور اسکی بیوی اندراسوگا تھی، (اندراوشنو کی ایک بیوی کا بھی نام تھا) اور سکندر اعظم نے انھیں یہان بھیجا تھا، معلوم نہین یہ افسانہ کہانتک صحیح ہے،

سکندر اعظم کی فوج نے جب ہائڈیس پس کو پار کرکے بنگال پر چڑھائی کرنے سے انکار کیا تھا اور اس انکار سے مشرق کے فتوحات کا خواب پورا نہ ہوسکا، تب سکندر نے اندس کو چھوڑ کر خشکی کا راستہ پکڑ لیا تھا، لیکن اوپر کے افسانہ سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے، کہ کیا سکندر نے سمندر کے راستہ سے مشرق پر پھر حملہ کیا تھا،؟ یہ معلوم ہے، کہ اوس نے نئی دنیا کے دریافت کرنے کے لئے ایک اسکیم بنائی تھی جس کے ذریعہ اوس نے اندس کے دہانہ سے بحر فارس تک بحری راستہ نکالا تھا، ممکن ہے اس اسکیم کے ماتحت کوئی بیڑا اوس نے جنوب بھی بھیجا ہو، یا کچھ جہاز راستہ بھٹک کر اس طرف جانکلے ہون، یہ معلوم ہے کہ جب سکندر اعظم نے دنیا کو خیرآباد کہا تو وہ ایک بحری مہم کی تیاری مین مصروف تھا، اور اس

ایک ہزار جہاز سے زیادہ کا بیڑا تیار کیا تھا، جس کے ذریعہ وہ بحیرۂ عرب کے راستہ سے بابل سے مشرق تک بحری راستہ کھولنا چاہتا تھا، ممکن ہے یہ سکیم اور وسیع کردی گئی ہو، لیکن ہمارے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے جس سے یہ ثابت ہو سکے، کہ چوتھی صدی عیسوی میں سکندر اعظم کے جہازرانوں نے سولو کو آباد کیا، البتہ سولو کی تاریخ سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ یہاں راجہ بے گندا اسمبو ونگن (زمبوانگا کا مورو نام ہے) سے آیا تھا، اور وہاں وہ منگکابو سماترا سے گیا تھا، منگکابو ملے قوم کا گہوارہ سمجھا جاتا ہے، اور یہی قوم اس جزیرہ کی فاتح تصور کیجاتی ہے، مقامی مورخین منگکابو شہزادوں کا سلسلہ سکندر اعظم سے ملاتے ہیں، ان کا نسب نامہ بہت ہی قدیم ہے، جو عالم کل سلطان محمد جمال الکرام کے حکم سے ۱۲۳۹ھ مطابق ۱۸۲۳ء میں مرتب کیا گیا تھا، مورو قوم کے تحریری حالات اتنے قدیم اور نایاب ہیں کہ اسلام سے قبل اور بعد کے اثرات کا تجزیہ مشکل ہے، لیکن تاوسوگس قوم (مورو کی زبان میں سولو کا نام ہے) میں یہ خیال پھیلا ہوا ہے، کہ یہاں کے پہلے باشندے سکندر اعظم کے بھیجے ہوئے تھے، اور قریب قریب ایسی ہی روایت سماترا کے پیلمبنگ کے اضلاع میں بھی مشہور ہے،

ڈاکٹر ان، ام، سیلی بی (Dr. N. M. Saleeby) اس افسانہ کو اس واقعہ سے منسوب کرتے ہیں، جب چودھویں صدی میں سمال یا بجاؤن جھور سے ہجرت کر کے آتے تھے، لیکن سمال میں بھی یہی افسانہ مشہور ہے، کیونکہ وہ ملے قوم کی آخری جماعت تھی، جو فلیپائن کے اندر داخل ہوئی، سولو کی اصل تاریخ راجہ بے گندا سے شروع ہوتی ہے، یہ ایک منگکابو شہزادہ تھا، اور یہی سولو کے حکمران خاندان کا بانی ہوا، گویا قدیم ترین خاندان اسی کا ہے، ملے کے شاہی خاندان بھی منگکابو ہی سے اپنا سلسلہ ملاتے ہیں،

یہاں اسلام کی ابتدائی تاریخ کے سلسلہ میں دو نام خصوصیت سے لئے جاتے ہیں، ایک تو یہی راجہ بے گندا اور دوسرا مقدم ہے، یہ ایک مشہور عرب عالم اور قاضی تھے، یہی وہ شخص ہیں جنھوں نے

ملکا کے والی سلطان محمد شاہ کو مشرف بہ اسلام کیا تھا، اور اس کے بعد انھوں نے سولو اور منڈانو کی طرف رُخ کیا، اور تبلیغ کے سلسلہ میں تمام جزائر شرق الہند کا دورہ کیا، اور ان جزیروں میں انہی کی تبلیغی کوششوں سے اسلام کی روشنی پھیلی، نہ کہ تلوار سے، فلیپائن میں ان کا داخلہ ۱۳۸۰ء کے قریب ہوا تھا،

اس کے دس سال بعد راجہ بے گندا نے سولو کو فتح کیا، اس کی فتح کے حالات سے یہ قیاس ہوتا ہے، کہ وہ بارود کے استعمال سے واقف تھا، اور اب یہ بات پایہ ثبوت کو پہونچ چکی ہے، کہ چودھویں صدی میں بارود عربوں کے علم میں تھی، اور سماترا سے ان کے مستقل تجارتی تعلقات تھے، اسلئے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، کہ انھوں نے اس کو وہاں بھی رائج کر دیا ہو، راجہ بے گندا وہیں سے ایک فاتح کی حیثیت سے یہاں آیا تھا، مقدم نے پہلے ہی سے اسلام کیلئے زمین ہموار کر دی تھی، کہ ایک دوسرا مبلغ ابو بکر یہاں پہونچا، اس نسب نامہ سے جس کا ڈاکٹر سیلی بی نے حوالہ دیا ہے، یہ پتہ چلتا ہے، کہ ابو بکر برونی (مشرقی بورنیو میں ایک ریاست) کے راستہ سے پیلمبنگ سے ہوتے ہوئے بانسا (سولو کا قدیم دار السلطنت) پہنچا، اور یہاں راجہ بے گندا کے یہاں ٹھہر کر سولو میں اپنے مذہب کی تبلیغ شروع کر دی، وہاں اس کی بڑی عزت و توقیر ہوئی، یہاں تک کہ راجہ بے گندا نے اپنی لڑکی پارامیسولی سے اس کی شادی کر دی، اس طرح وہ خود سلطان بن گیا، وہاں عام طور سے مشہور ہے کہ وہ مکہ سے آیا تھا، اور بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے، کہ وہ حضرت امام زین العابدین کے صاحبزادے تھے، جو مکہ سے ملکا آئے تھے[1]
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ پہلے زمبوانگا کے جزیرہ بسا میں گئے، اور وہاں کے باشندوں کو مسلمان کیا، پھر یہاں سے سولو بلائے گئے،

---

[1] اس نام کے امام زین العابدین کے کوئی صاحبزادے نہ تھے اور نہ ان کا ملکا جانا تاریخی حیثیت سے صحیح ہے،

ملکا کی تاریخ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ابو بکر ایک مشہور آدمی تھا، اور مذہب اور شریعت کا بہت بڑا عالم تھا، ملیشیا مین اس کا مشن ابو اسحاق کے مسلک کی تبلیغ تھی، جو ایک کتاب دار المنظوم مین درج ہے، وہ ۱۴۵۰ء مین سولو پہنچا، اور وہان مسجدین بنوائیں، اور مذہب و شریعت کی تعلیم دیتا رہا، یہان اسلام کی ایسی بنیاد رکھی، جو آجتک ویسی ہی مستحکم ہے، راجہ بے گندا کے کوئی اولاد نرینہ نہ تھی، اس نے وہی وہان کا حکمران ہوگیا، وہ یہان اپنے نام کے بجائے "السلطان الشریف الہاشمی" کے لقب سے مشہور ہے، سولو کا شاہی خاندان اپنا سلسلۂ نسب راجہ بے گندا کی لڑکی پارامی سولی اور ابو بکر سے ملاتا ہے، اسلام کا یہ مبلغ ۱۴۸۰ء مین راہی ملک بقا ہوا، جو سلطنت اوس نے قائم کی تھی، اسکی قوت لوزن اور جنوبی دریائے چین تک محسوس کی جاتی تھی، اور اس کی تجارت چین اور جاپان سے لیکر ملکا، سماترا اور جاوا تک پھیلی ہوئی تھی، آخر مین اسپین اور پرتگال اس کی تجارت کے حریف بن گئے،

یہ تاریخ کا عجیب واقعہ ہے کہ چند آدمی اسلام کا جھنڈا لیکر آتے ہین، اور سارے جزیرون پر چھا جاتے ہین، انکی بہادری اور ہمت کے نہ صرف ان کے پرانے دشمن اسپینی بلکہ امریکن بھی قائل ہین، ساری دنیا کے جہازران جو سلیبس، سولو اور جنوبی دریائے چین مین داخل ہونا چاہتے تھے، ان سے واقف اور خوفزدہ تھے، یہ اسپینی اور امریکن سپاہیون کی بہادری نہ تھی جس نے سولو اور منانڈا کے جزائر کی بادشاہت چھین لی، بلکہ موجودہ انجن کے جہاز اور بندوق کی ایجادات ہین جس نے انھیں بے بس کر دیا، اگرچہ اب مورو کی تباہی ضرب المثل ہوگئی ہے لیکن اب بھی اپنے عقیدہ پر مضبوطی سے قائم رہنا اور اس کیلئے جان دیدینا انکی خصوصیت ہے،

فلپائن کے مورو کئی حصون مین بٹے ہوئے ہین، ان مین سب سے زیادہ مشہور سولو ہے، جس کو مورو کی زبان مین تاؤسوگس کہتے ہین، سولو کا سلطان تنہا مسلمان شاہزادہ ہے،

جاو کے ماتحت ہے، ان کی زبان تاؤسوگس نلایا کی زبان ہے، یہ زبان جنوبی بورنیو مین برنے سے لیکر زمبوانگا کے مشرقی کنارون تک سمجھی جاتی ہے، اس زبان مین اگرچہ چینی اور دوسرے عنصر بھی ہین، لیکن سنسکرت اور عربی کے الفاظ ان مین بہت زیادہ ہین، گو مورو قوم کی تہذیب کا سلسلہ ہندو دور سے ملتا ہے، لیکن اب ان پر اسلامی رنگ بہت گہرا ہے، یہ بھی دوسرے جزیرہ کے مورو کی طرح شافعی مسلمان ہین،

سولو کے جزیرہ کے کنارے اور زمبوانگا کے جزیرہ نما سے ملحق تاؤسوگس کے ساتھ ایک قوم ساماال بھی ہے، یہ ملایون کا آخری قافلہ تھا، جو جوہور سے ہجرت کرکے آیا تھا، ان کی دو شاخین ہین، ایک دلدلون کے پاس مکانون مین سکونت رکھتے ہین، اور دوسرے باجاؤن یا دریائی خانہ بدوش جو کشتیون پر رہتے ہین، یہی لوگ دریائے سولو اور سلیبس کے ملاح تھے، جو تاؤسوگس کے ساتھ چین اور ملکا کے ساحلوں پر حملہ مین جہازرانی کی خدمت پر مامور تھے، آج بھی وہ دنیا مین جہازرانی کے سب سے زیادہ شائق ہین، ساما لی تاؤسوگس سمجھتے ہین، لیکن آپس مین ایک خاص زبان بولتے ہین،

تیسرا حصہ جنوبی منڈاناؤ کی بلندیون پر لاناؤ جھیل کے چارون طرف مورو کی خلیج سے لیکر دریائے منڈاناؤ تک پھیلا ہوا ہے، یہ لوگ مارا ناؤ کہلاتے ہین، اور دوسری زبان بولتے ہین، یہان ملے قوم اور قدیم نسبون کا گہرا امتزاج معلوم ہوتا ہے، مورو کے دوسرے جزیرون کی بہ نسبت یہان سماترا کے فنون اور طرز تعمیر زیادہ نمایان ہین، ان کے لباس، مکانات اور مسجدین منگکابو کی طرح ہین، اسپینی کبھی ان پر فتح حاصل نہ کر سکے، اور امریکن بھی بڑے طویل اور مسلسل محاصرہ کے بعد کامیاب ہوئے، یہ حد سے زیادہ غیور ہین، انھیں غیر ملکیون کی موجودگی کے باوجود کوئی پریشانی نہین ہوتی، یہ لوگ ہر سال دوسرے جزیرون کے باشندون کے ساتھ بڑی تعداد مین ایک ساتھ حج کے لئے جاتے ہین،

لاناؤ کے جنوب مین، ابو گرینڈ کی زرخیز وادیون مین مے گنداناؤ مورو رہتے ہین، یہین ۱۵۲۳ء مین مشہور اسپینی باربوسہ اور اوس کے بنتیس ساتھی قتل کیئے گئے تھے، مے گنداناؤ مین عربی عنصر کم ہے، اور نیچے طبقون مین مقامی رنگ بہت گہرا ہے، ان کی مستقل اپنی زبان ہے، اگرچہ مارناؤ سے کچھ ملتی ہوئی ہے، مے گنداناؤ کے باشندے مسلمانوں کے لئے پیتل کے ہتھیار بنایا کرتے تھے، ان کا مرکز کوٹاباٹو تھا، اور یہیں کی لنٹا کا نامی ایک چھوٹی سی پیتل کی توپ بہت مشہور تھی، اسے کشتیوں پر رکھکر اس کے ذریعہ پرسکون سمندر مین طوفان بپا کر دیتے تھے،

جزیرہ منداناؤ کے اور جنوب مین دواؤ کے قریب سرنگانی خلیج کے پاس ان کی کچھ آبادی ہے جن کو سنگل مورو کہتے ہین، یہ لوگ بوگس مورو کی ایک شاخ ہین، اور سلیبس سے یہاں ہجرت کرکے آئے تھے، بوگس مورو کے متعلق خیال ہے، کہ وہ ۱۲۹۵ء مین اسلام قبول کر چکے تھے، یہ فلیپائن کے آخری بچے ہوے ملایا تھے جنھون نے اسلام قبول کر لیا، یہ بہت ہی بہادر، دلیر، اور خوفناک ہین،

بسائین کے جزیرون مین بھی کچھ مورو رہتے ہین، جو یاکان کہلاتے ہین، ان کا چہرہ مہرہ اور لباس دوسرے مورو سے بہت ممتاز ہے،

انکا آخری حصہ جن کی تعداد بہت کم ہے، پلوان کے جزیرون مین رہتا ہے، اور یہ پلوان مورو کہلاتے ہین، اور اپنی خاص زبان بولتے ہین، ان مین آس پاس کے علاقون کے عنصر کی آمیزش کا پتہ چلتا ہے، جزیرون کے تین چوتھائی سے زیادہ مورو تاؤسوگس، سماآل، مارناؤ اور مے گنداناؤ کے علاقون مین رہتے ہین، اور باقی حصہ سنگل، یاکان اور پلوان کے علاقون مین آباد ہے، ۱۹۱۸ء کی مردم شماری مین انکی تعداد ۳،۰۳،۴۴۴ تھی، اب تو اور بھی زیادہ ہو گئی ہوگی،

اتنی قلیل مدت مین فلپائن مین اسپینیون کی کامیابی قابل غور ہے ایک یہودی مصنف نے

اسکی وجہ یہ بتائی ہے کہ وہان کے باشندے غیر مہذب تھے اور کسی نے اسکا سبب مذہب کو بتایا ہے لیکن یہ دونوں سبب صحیح نہین ہین۔

نہر سویز کی تعمیر اور اہل یورپ کے مشرق مین پہونچنے سے پہلے بحیرۂ ہند مین ایک اقتصادی جنگ ہو چکی تھی جسمین عرب ہرجگہ کامیاب ہو چکے تھے، یہ وہ زمانہ تھا جب پرتگالی راس امید کا چکر کاٹ کر مشرق مین پہنچ چکے تھے، اور عرب اور ایرانی تجار اپنے پیشرو ہندوؤن کے بتائے ہوے راستون سے گرم مسالے کی تجارت پر قابض ہو چکے تھے، اور اس میدان مین انکا کوئی حریف باقی نہ رہا تھا، تجارت کیساتھ ساتھ وہ مذہب کو بھی اپنے سینہ سے لگائے ہوئے تھے، اور اسی زمانہ مین اسلام نہایت خاموشی سے مرکزی افریقہ کے اندر گھستا ہوا چلا جا رہا تھا، مسلمان تاجر مبلغ بھی تھے، اور اسطرح تجارت ہی کے وسیلہ سے اسلام ملے پر بھی چھا گیا، جہان تلوار کی مطلق ضرورت نہ ہوئی،

سولہوین صدی کے اوائل مین گرم مسالہ کی تجارت مین مسلمانوں نے بڑی ترقی کی، سنگاپور کے شمال ملکا مین انکا مرکز تھا، اور یہ زمانہ ملکا کی تاریخ کا زرین عہد تھا، اسی وقت سے اس سونے کی کان پر پرتگالیون کی حریصانہ نگاہین پڑنے لگین، چنانچہ ۱۵۰۸ء مین ڈیوگو لوپز ڈی سیقرا (Diogo Lopez de Sigueira) انکی فتح کے لئے بھیجا گیا، یہ مہم پہلے کوچین پہنچی اور یہان مشہور پرتگالی الفانسو البوکرک سے کچھ مزید فوجین لیکر جسمین ایک شخص فرڈی ننڈ میگلین بھی تھا، ملکا پہنچی لیکن ناکام رہی، اور سیقرا کو یورپ واپس جانا پڑا، دو سال بعد ایک دوسری مہم ڈیوگو مونڈز ڈی واسکونسلوس (Diogomon dez Vascomcellos) کی سرکردگی مین بھیجی گئی، میگلین بھی ساتھ تھا، کوچین سے اسکے ساتھ مشہور تجربہ کار وائسرائے البوکرک افسر کل کی حیثیت سے شامل ہو گیا اور ۱۵۱۱ء مین بڑی خونریز لڑائی کے بعد ملکا ملے کے ہاتھون سے چھن گیا، اس کارنامہ کے صلہ مین میگلین کو کپتان بنا دیا گیا، مشرق کے اس تجارتی مرکز پر قبضہ کرنے کے بعد پرتگالی قانع ہو گئے تھے لیکن البوکرک نے گرم مسالہ کیلئے میگلین کو ایک جہاز پر مولوکس بھیجا تھا، اور اسی سلسلہ مین مولوکس تک جو فلپائن کے مشرق مین ہے ان کا اثر پہنچ گیا،

"ع-ا"

اخبارِ علمیہ

مصر کی آبادی

مصر کی پہلی مردم شماری ۱۸۸۲ء میں ہوئی تھی، اس وقت کل آبادی ۶،۸۰۴،۰۲۱ تھی، پندرہ برس کے بعد ۱۸۹۷ء میں دوسری مردم شماری کے وقت ۹،۷۱۴،۵۲۵ تعداد ہوگئی، اس کے بعد دس سالہ مردم شماری کے نتائج یہ ہیں:

۱۹۰۷ء = ۱۱،۲۸۷،۳۵۹ = ۱۹۱۷ء = ۱۲،۷۵۰،۹۱۸ = ۱۹۳۷ء = ۱۵،۹۱۴،۳۷۸ اور پندرہ ہیں،!

قوم و مذہب کے اعتبار سے آبادی | مسلمان ۹۱،۳۷ ٪ قبطی آرتھوڈکس ۸۳،۱۰۶ ٪ دوسری مسیحی جماعتیں ۳۹،۱ ٪ اسرائیلی ۴۰،۰ ٪

اہلِ حرفہ کی آبادی | (۱) وہ کاشتکار جو خود اپنی زمین کے مالک ہیں، ۸۵۹،۹۵۵ (۲) وہ کاشتکار جو زمین کو لگان پر لیتے ہیں، ۲۶۲،۱۹۲ (۳) مزدور پیشہ ۳،۲۳۴،۷۱۱ (۴) چرواہے، چڑیوں اور جانوروں کے پالنے والے، ۴۸،۷۴۵ (۵) باورچی ۲۴،۲۴۷ (۶) بڑھئی ۵۸،۶۵۱ (۷) کپڑا بننے والے ۵۹،۸۷۱ (۸) سوت کاتنے والے ۴،۹۶۲ (۹) جوتا بنانے والے ۲۶،۵۰۷ (۱۰) حجام ۴۲،۰۶۷ (۱۱) بہشتی ۱۸،۱۳۶ (۱۲) معمار ۲۵،۶۸۱ (۱۳) لوہار ۱۴،۶۸۶ (۱۴) قصاب وغیرہ ۸،۱۶۶ (۱۵) ٹرین، موٹر اور ٹرین چلانے والے ۱۰،۱۶۳ (۱۶) گاڑیبان ۵۹،۱۷۴،

(۱۷) بحری کام کرنے والے ۱۶،۱۴۴ (۱۸) تاجر ۲۷۰،۹۲۸،

(۱) علمائے دین ۱۱،۵۶۷ (۲) طبیب ۳،۳۲۷ (۳) انجینیر ۶،۱۱۳ (۴) انسپکٹر مدارس وغیرہ، ۳،۸۹۵ (۵) اساتذہ ۲۱،۲۰۷ (۶) طلبہ ۶۱۹،۶۸۶،

آخری مردم شماری میں غیر مصریوں کی تعداد حسب ذیل تھی،

(۱) یونانی ۶۹،۹۰۰ (۲) اطالوی ۴۷،۹۵۰ (۳) برطانوی ۳۱،۸۰۶ (۴) فرانسیسی ۱۸،۸۲۱ (۵) ترک ۳،۳۴۸،

"ا-ن"

فضائی فوٹوگرافی

فضائی فوٹوگرافی کا فن گذشتہ جنگ میں وجود میں آچکا تھا، اور زمانہ کی روز افزون ترقی کے ساتھ اب یہ فن بہت ترقی کر گیا ہے لیکن جدید توپوں کی دوررس ضربیں اس فن کی راہ میں دشواریاں بھی پیدا کر دی ہیں، چنانچہ بغیر خطرہ کے کم از کم بیس ہزار فٹ کی بلندی پر اڑتے ہوئے ہوائی جہاز سے فوٹو لیا جا سکتا ہے، اس بلندی اور دوری کی وجہ سے بڑے اور متعدد کیمروں کا استعمال ناگزیر ہوگیا ہے، البتہ رات کی تاریکی میں چار ہزار فٹ کی بلندی سے فوٹو لیا جا سکتا ہے، رات میں مخصوص شیشے استعمال کئے جاتے ہیں، اس میں دشواری یہ ہے کہ سرچ لائٹ، پھٹنے والے گولے اور آتشین گولیوں کی بوچھار سے بعض وقت کیمرہ ناکامیاب رہتا ہے، فضائی فوٹوگرافی اس کا استعمال ایک مستقل لیکن آسان فن ہے، جو فوجی نقطۂ نظر سے بہت اہم ہے، فضائی فوٹوگرافی سے بمباری اور اس کے اثرات و نتائج معلوم کرنا آسان ہوگیا ہے، اس سے دشمن کی نقل و حرکت کی صحیح تصویر لی جا سکتی ہے، گرنے کے بعد پھٹ کر روشن ہونے والے بموں کی روشنی میں زمین کی ہر چیز کا فوٹو لیا جاتا ہے، اس کیمرہ کی مشین بہت صحیح کام دیتی ہے، وہ آسانی سے

استعمال کیجاتی ہے، اور زیادہ استعمال سے اس مین کوئی خرابی نہین پیدا ہوتی، اس کے پرزے کیل دبانے سے خود بخود کام کرنے لگتے ہین، کیمرہ کی مشین کو فضائی سردی سے محفوظ رکھنے کے لئے گرمی کا خاص اہتمام رکھا جاتا ہے، اسکی مدد سے صحیح بمباری آسان ہو جاتی ہے، فضائی فوٹو گرافی کا فن مخصوص تعلیم کا محتاج ہے، اس فن مین کامیابی کا معیار جلد فوٹو لینا اور اسکو تیار کرنا ہے، فوٹو کی صحت و خوبی پر جنگی معلومات کے حصول کا دارومدار ہوتا ہے، اور اسی پر سنگین بمباری موقوف ہے،

فضائی ریل

شہر گلاسگو کے شور و ہنگامہ سے دور پہاڑون کے دامن مین ایک چھوٹے سے قصبہ کے قریب رسل و رسائل کا ایک عجیب و غریب ذریعہ نظر آتا ہے، معمولی ریلوے لائن کے اوپر کافی بلندی پر فولاد کی شہتیرون کا ایک مسلسل ڈھانچہ ہے، فضا مین ایک چھوٹا سا اسٹیشن قائم ہے، اور سگرٹ کی شکل کی ایک حیرت انگیز گاڑی معلق نظر آتی ہے، اس گاڑی کے دونون سرون پر چار چار دستون کے دو پنکھے لگے ہوتے ہین، انہی پنکھون کے زور سے شہتیر سے معلق لیکن بالکل محفوظ اور ایک سو بیس (۱۲۰) فی گھنٹہ کی رفتار سے یہ گاڑی روان دوان نظر آتی ہے، یہ گاڑی نہایت تیز رفتار اور ہر قسم کے جھٹکے اور خطرہ سے محفوظ ہے، اس کا اندرونی حصہ گویا ایک نہایت آراستہ اور فضا مین تیرتا اور دوڑتا ہوا ڈرائنگ روم ہے، اس لائن کی تعمیر مین چالیس سے ساٹھ ہزار پونڈ فی میل صرف آتا ہے،

افریقہ کی شکاری چڑیا

افریقہ مین سکرٹری برڈ نامی ایک عجیب و غریب چڑیا ہے جس کی سب سے مرغوب غذا سانپ ہے،

عجب نہین کہ گرم ممالک کی حکومتیں اس چڑیا کو اپنے ملکون مین لیجا کر اس کی نسل پھیلائین، اور زہریلے سانپون کی تباہ کاریون سے انسان کو نجات دلائین، یہ چڑیا عقاب سے بہت مشابہ ہے، اس کے سر پر ذرا پیچھے پرون کی کلغی ہوتی ہے، اور اس کے پاؤن سیدھے ہوتے ہین، افریقہ مین اس کا پھنسانا یا مارنا قانوناً ممنوع ہے،

کوکابرّا

اسٹریلیا مین کوکابرا نامی ایک مشہور و محبوب چڑیا ہے، اس کو سٹلرس کلاک بھی کہتے ہین، یہ چڑیا صبح و شام بڑی ترنم اور پر کیف آواز سے کوکتی ہے، صبح کو دن کے خیر مقدم اور شام کو اس کی رخصت کرنے مین اس جنس کی تمام چڑیان اس کی ہمنوائی کرتی ہین، اسٹریلیا کے لوگ اس چڑیا کی بڑی حفاظت کرتے ہین، وہ زہریلے سانپون اور چھپکلیوں کا بڑے شوق سے شکار کرتی ہے،

چھینک سے بیماریان

جب ہم چھینکتے ہین تو منہ اور ناک کے انجرات اور ذرات ایک منٹ مین دو میل کی رفتار سے فضا مین منتشر ہوتے ہین، پروفیسر مارشل جینی سن امریکہ نے ان پھیلے ہوئے انجرات کی تصویرین لی ہین، ان مین مختلف قسم کے جراثیم پائے گئے، پروفیسر موصوف کا خیال ہے، کہ تنفس کے امراض کا ایک سبب چھینک کے یہ جراثیم بھی ہوتے ہین،

"ن۔ص"

ادبیات

شورِ نشور

از

جناب نشور واحدی

رنگ یہان بہت مگر رنگ سے کام بھی نہین — تیری یہ بزمِ آب و گل دل کا مقام بھی نہین

بس اِکہ کہیں نہ جاگ اُٹھیں سوئی ہوئی قیامتین — یہ تو خرامِ حشر ہے، حشرِ خرام بھی نہین

ذوقِ گناہ دمبدم شوقِ شباب نو بہ نو — عمر تمام ہو تو ہو لطف تمام بھی نہین

حُسن تمام گفتگو عشق تمام خامشی — رفعِ شکوک بھی نہین قطعِ کلام بھی نہین

جلوۂ حُسن مضطرب، نورِ نگاہ بے قرار — آنکھ کہان ٹھہر سکے، حسن مقام بھی نہین

قربِ جمالِ اولین، شرمِ وصالِ بے پناہ — ہائے ری منزلِ شباب ہوشِ سلام بھی نہین

جب بھی ہو مجھکو ہوش ہو بس ہو وہی مری سحر — رند کی صبح بھی نہین مست کی شام بھی نہین

سجدہ کہان! رکوع کیا! میری نماز کیف مین — ساقیِ مست کی قسم ہوشِ امام بھی نہین

مے سے اگر گریز ہے سجدہ تو خُم کو کیجیے — بادہ حرام ہو تو ہو سجدہ حرام بھی نہین

میری نصیحتین فضول میری ملامتین عبث — رند ہوں پختہ کار ہون میکشِ خام بھی نہین

آپ کی زندگی نشور آپ کی شاعری نشور

حُسن تمام حُسن! ہے صوت و کلام بھی نہین،

حشرِ جذبات

از

جناب ثاقب کانپوری

اگرچہ جلوہ ترا خوگرِ حجاب نہین، — مگر یہ میری نظر ہے جو کامیاب نہین

رہینِ ضبط و سکون میرا اضطراب نہین — کہ تیرا عہدِ تمنا خیال و خواب نہین

تو اپنے عشق میں اتنا تو جذب پیدا کر — کہ جلوہ خود ہی پکارے کوئی حجاب نہین

رہیگی حسرتِ نظارہ عمر بھر تجھکو — تری نظر کو خود اندازۂ حجاب نہین

امید تجھ سے ہو کیا اے فریبِ نمود — مری نگاہ ابھی تک تو کامیاب نہین

نہین ہے اب مرا دل شکوہ سنجِ مستوری — کہ دیکھتا ہون جہانتک کوئی حجاب نہین

گزر گئی ہین تری بے نیازیان حد سے — کہ میرا گریۂ شب تک بھی مستجاب نہین

فریبِ حُسن ہے یا ہو سکون ہی مجھکو — مین کہہ رہا ہون میرے دل کو اضطراب نہین

ادھر بھی کاش ہو تیری نگاہِ لطف نواز — کہ میرے شوق کی دنیا مین انقلاب نہین

رہِ مراد مین جس نے کہ جان تک دیدی — تو اوس کو کس لئے کہتا ہو کامیاب نہین

عجیب عشق کی مجبوریان ہین اے ثاقب

وہ سامنے ہین مگر دیکھنے کی تاب نہین،

غزل

از جناب حسرت ترمذی بی اے ایل ایل بی

جمالِ یار اگر بے نقاب ہو جاتا — جہانِ عشق میں اک انقلاب ہو جاتا

وہ بے حجاب جو ہوتا تو فرطِ حیرت سے — ہر ایک تارِ نظر اک حجاب ہو جاتا

شعاعِ حسن میں اک کاش یہ کشش ہوتی — فنائے بحرِ تجلی حباب ہو جاتا

ترے جمال کا دیدار سخت مشکل تھا — نہ یہ کہ تیرا تصور بھی خواب ہو جاتا

ترے کرم کی بھی ہم کو نہ آرزو رہتی — ستم ہی کاش ترا کامیاب ہو جاتا

سکونِ قلب کی تم پر حقیقتیں کھلتیں — جو میرا نالۂ دل کامیاب ہو جاتا

مزاجِ عشق کی وحشت پسندیوں کی قسم — سکونِ دل سببِ اضطراب ہو جاتا

یقینِ مرگ سے کچھ ہمتیں بڑھیں ورنہ — ترے فراق میں جینا عذاب ہو جاتا

جفائے حسن کا حسرت اگر حساب نہ تھا
وفائے عشق کا کیوں کر حساب ہو جاتا

غزل

از جناب محمد علی خان صاحب اثر رامپوری

ساقیا دور میں اب لا عوضِ جام کچھ اور — کہہ رہی ہے روشِ گردشِ ایام کچھ اور

یاد پھر آئی ہیں آغازِ جنوں کی راتیں — اور پیچھے کو پلٹ گردشِ ایام کچھ اور

حسن کا مرتبہ حیرت نے سمجھنے نہ دیا — جتنا دیکھا انھیں بڑھتا گیا ابہام کچھ اور

حسن پر قیدِ تعین سے ادھر حرف آیا — اور ادھر حدِ نظر نے کیا بدنام کچھ اور

اک سے تکمیلِ نظر ایک سے توہینِ نظر — حسن در پردہ جدا حسن سرِ بام کچھ اور

جو نہ دیکھا نہ سنا تھا وہ سنا اور دیکھا — جو نہ ہوتا تھا ہوا اے دلِ ناکام کچھ اور

ان کے وعدے ہی بدلتے نہیں دن رات اثر
حالِ عالم یہ ہے، صبح ہے کچھ شام کچھ اور

سر شاہ سلیمان مرحوم کا خط مولانا سید سلیمان ندوی کے نام

جنابِ مکرم۔ السلام علیکم۔

ہنوز اس کا ترجمہ نہ ہوا۔

قانون مسعودی کو صحیح طور پر وہ سمجھ سکتا ہے جس نے ریاضی ایم اے تک پڑھی ہو۔ ایسے لوگ عربی سے ناواقف ہوتے ہیں اور اکثر فارسی بھی اچھے طور پر نہیں جانتے۔ اردو میں ترجمہ ہو جانے سے ایک کثیر تعداد کتاب سے واقف ہو جائیگی اور اسکا مفید حصہ مغربی تعلیم یافتہ کے سامنے پیش کریں گے۔ افسوس ہے کہ محض عربی دان اس فن کی طرف توجہ نہیں کر سکتے۔ محض عربی متن کے شائع ہو جانے سے کافی فائدہ نہ ہوگا۔ اگر اردو ترجمے کے ساتھ متن شائع کیے ہو تو کتاب کارآمد ہوگی۔ آپنے تحریر فرمایا ہے کہ اگر اصل عربی و فارسی ٹکسٹ شائع ہو جائے تو بڑا کام ہے۔ مہربانی فرما کر اطلاع کیجیے کہ فارسی ٹکسٹ کہاں دستیاب ہو سکتی ہے اور کس کتب خانہ میں موجود ہے۔

والسلام

شاہ محمد سلیمان

جوبلی گرد
نینی تال

۳۰ جون (سنہ ۱۹۴۰ء)

مطبوعات جدیدہ

افتتاح الاندلس مترجمہ جناب محمد جمیل الرحمن صاحب ایم اے، پروفیسر جامعہ عثمانیہ تقطیع اوسط، ضخامت ۱۶۴ صفحے کاغذ سپید، ٹائپ اچھا، **قیمت** :- عمر
پتہ :- کتابستان الہ آباد،

اسلامی اندلس کی تاریخ مین ابو بکر محمد بن عمر المعروف بہ ابن القوطیہ اشبیلی المتوفی ۳۶۷ھ کا رسالہ تاریخ "افتتاح الاندلس" نہایت قدیم اور مستند ماخذ ہے، اسلامی اندلس کا کوئی مورخ اس سے بے نیاز نہیں رہ سکتا، یہ رسالہ عرصہ ہوا یورپ مین فرانسیسی اور اسپینی ترجمہ کے ساتھ شائع ہوچکا ہے، پروفیسر جمیل الرحمن صاحب نے اردو مین اس کا ترجمہ کیا ہے، ترجمہ کے ساتھ فاضل مترجم کے قلم سے فتح اندلس کی تاریخ پر نہایت مفید مقدمہ اور اصل رسالہ پر بیش قیمت اور پر از معلومات حواشی ہین، مقدمہ بجائے خود فتح اندلس کی مختصر تاریخ ہے، حواشی مین دوسرے مورخین کے بیانات سے افتتاح الاندلس کے اجمال کی تفصیل اور جزدی اختلافات کی تشریح ہے، اس سے فتح اندلس کے مختلف پہلوؤن پر دوسری مورخین کے بیانات بھی سامنے آجاتے ہین، لائق مترجم نے بڑی تلاش اور کاوش سے یہ حواشی لکھے ہین، اور اکثر موجود ماخذون سے استفادہ کیا ہے، اس کتاب کے ترجمہ سے اردو زبان مین اسلامی اندلس کے متعلق ایک مفید کتاب کا اضافہ ہوا،

فن تقریر شائع کردہ ادارۂ ادبیات اردو تقطیع چھوٹی ضخامت ۹۰ صفحے، کاغذ معمولی، کتابت وطباعت بہتر قیمت ۱۲ر، پتہ :- سب رس کتاب گھر، خیریت آباد حیدر آباد دکن،

تقریر و خطابت گو ایک فطری ملکہ ہے تاہم اس مین اکتساب کو بڑا دخل ہے، اور مشق و مہارت سے ایک غیر فطری مقرر بھی مقرر بن سکتا ہے، دوسرے فنون کی طرح فن تقریر کے بھی کچھ اصول و قواعد اور لوازم و شرائط ہین، ترقی یافتہ زبانون مین اس فن پر کتابین ہین، لیکن اردو مین اس موضوع پر غالبًا کوئی مستقل کتاب نہین ہے، آج سے پچاس سال پیشتر کسی انگریزی کتاب کا ترجمہ کیا گیا تھا، جو اب نایاب ہے، اور اسکی زبان بھی بہت پرانی ہے، ادارۂ ادبیات اردو نے اسکی زبان کی اصلاح اور بعض ضروری اضافے کرکے اوس کو دوبارہ شائع کیا ہے، کتاب کے دیباچہ مین فن تقریر کی اہمیت اور قدیم ترقی یافتہ قومون اور ملکوں، یونان، روما، اسلامی عہد، انگلستان، فرانس اور ہندوستان مین تقریر کی تاریخ پر مختصر تبصرہ ہے، اصل کتاب مین مقرر کے فطری اور وہبی اوصاف اور اکتسابی کمالات اور تقریر کے جملہ عناصر و اجزاء اصول و قواعد اور لوازم و شرائط کی پوری تفصیل ہے، نوآموز مقررین کے لئے یہ رسالہ مفید ہے،

نئی پود از جناب اظہر قدوائی، تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۶۲ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت عمر، شرکت ادبیہ دہلی،

یہ کتاب مؤلف کے اٹھارہ افسانوں کا مجموعہ ہے، اس مین نئی پود کے نقطہ نظر سے قدیم معاشرتی نظام، پرانی روایات و رسوم اور نئے خیالات و رجحانات کی مصوری کی گئی ہے، اور ہماری معاشرت کے بعض قابلِ اصلاح پہلوؤں کو دکھایا گیا ہے، "زمینداری" "ابن رئیس" "اگلے وقتون کے ہین یہ لوگ" "دادی اماں" "موت" اور "نئی پود" مین قدیم تہذیب و معاشرت اور پرانی روایات کی نہایت سچی تصویر ہے، اصلاحی افسانون مین "شادی" اور "بیوہ" سبق آموز ہین، "سامراج پور مین خیرات کے لئے ڈانس" اور "لیڈر" مین امراء و حکام کے حصول خیرات کے متمدن طریقے اور معمولی درجہ کے لیڈرون اور ان کے جلسے اور جلوس کا نہایت دلچسپ خاکہ ہے، یہ مجموعہ لطف بیان اور جزئیات کی مصوری

کے اعتبار سے بہت کامیاب ہے،

جاہ و جلال مترجمہ جناب صوفی غلام مصطفےٰ صاحب تبسم، ایم اے، لکچرار گورنمنٹ کالج لاہور، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۵۲ صفحے، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت مجلد ۱۲؍ پتہ :۔ غالباً مصنف سے ملے گی،

کیرل چپیک ایک مشہور چیک ڈرامہ نگار ہے، دنیا کی مختلف زبانون مین اس کے ڈرامون کے ترجمے ہو چکے ہین، اردو مین بھی اس سے پہلے بعض ڈرامون کا ترجمہ ہوا، جناب تبسم نے اس کے ایک تازہ ترین ڈرامے "پاور اینڈ گلوری" کا جاہ و جلال کے نام سے ترجمہ کیا ہے، اس مین متمدن دنیا کے غربا کی زبون حالی، حکومتون کے جنونِ جنگ، ان کے اندھے مقلد، عوام کی بے بصری، اور امن پسند مصلحین کے مساعی کی بے اثری کو نہایت موثر طریقہ سے دکھایا گیا ہے، یہ ڈراما یورپ کے اکابر کی خود غرضی، جاہ پسندی اور ان کے جنونِ جنگ کا بہت کامیاب مرقع ہے،

صہبائے ہند، از جناب نشور واحدی، تقطیع بڑی، ضخامت ۲۲۴ صفحے، کاغذ و کتابت و طباعت، بہتر، قیمت :۔ مجلد عہ۸ غیر مجلد عہ، پتہ :۔ نیجر نامی پریس کانپور،

یہ کتاب جناب نشور واحدی کے کلام کا مجموعہ ہے، نوجوان شعرا مین مصنف کا نام اور کلام تعارف کا محتاج نہین ہے، وہ فطری اور صاحبِ فکر شاعر ہین، ان کا کلام جدت و قدامت کے معتدل امتزاج کا اچھا نمونہ ہے، قدیم محاسنِ شاعری کا دامن بھی ان کے ہاتھون سے چھوٹنے نہین پایا ہے، اور حال و مستقبل کے تقاضون سے بھی وہ غافل نہین ہین، چنانچہ ان کی شاعری مین تغزل کا زمزمہ بھی ہے، صوفیانہ عرفان و حقائق بھی ہین، ملک و قوم کے لئے پیامِ زندگی بھی ہے، اور مذہب و ملت کا درس بھی، غرض اس مین تمام نئے اور پرانے ضروری عناصر موجود ہین، غزلین

خیالات کی رنگینی، جذبات کی سرمستی، اور ندرتِ خیال کا نمونہ ہین، جوش و سرمستی کے اعتبار سے بعض بعض غزلین بادۂ سرجوش کا حکم رکھتی ہین، عارفانہ اور قومی و ملی شاعری کے کم پہلو چھوٹنے پائے ہین، نئے شعرا مین یہ خصوصیت کم کسی دوسرے کے کلام مین ملے گی، غزلون کی زبان نہایت شستہ ہے لیکن نظمون مین چونکہ محدود زبان فکر و پیام کی بلندیون کا ساتھ نہین دے سکتی اسلئے کہین کہین پر زبان کے مقررہ حدود سے آگے بڑھنا پڑا ہے، کتاب کے شروع مین متعدد ارباب قلم کے تبصرے اور دیباچے ہین جن سے جناب نشور کی شاعری کی خصوصیات کا پورا اندازہ ہوجاتا ہے، امید ہے کہ اربابِ ذوق صہبائے ہند سے لطف اندوز ہون گے،

یادگار نصیر، مرتبہ سید ظہیر الدین صاحب علوی ایم اے لکچرار اردو مسلم یونیورسٹی علی گڈہ، تقطیع اوسط، ضخامت ۱۲۴ صفحے، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت عہ، پتہ شروانی بک ڈپو شروانی پریس علی گڈہ،

محمد نصیر الدین صاحب علوی مرحوم مصنف علی گڈہ ہمارے جوار جونپور کے بڑے باذاق، خوش مزاج، یار باش، اور بذلہ سنج لوگون مین تھے، شعر و شاعری کا بڑا ستھرا ذوق رکھتے تھے، خود بھی خوش گو شاعر تھے، لیکن ان کی شاعری خود اپنے ذوق کی تسکین کے لئے تھی، اسلئے شاعر کی حیثیت سے انھون نے کوئی عام شہرت حاصل نہین کی، تاہم ان کی شاعری کے قدردانون کا حلقہ خاصہ وسیع تھا، ان کے بھائی سید ظہیر الدین صاحب علوی نے یادگار نصیر کے نام سے ان کے کلام کا مجموعہ مرتب کیا ہے، اس کے شروع مین مرحوم کے احباب و مخلصین کے قلم سے ان کے حالات و سوانح ہین، یہ مجموعہ مرحوم کی ذہانت، طباعی، خوش مذاقی اور ذوق شعری کا نمونہ ہے، امید ہے کہ مرحوم کے قدردانون کے حلقہ مین اسکو بڑی مقبولیت حاصل ہوگی،

اہلِ دل کی دل آویز باتین مؤلفہ مولانا ابو المآثر حبیب الرحمان صاحب اعظمی،

تقطیع چھوٹی ضخامت ۳۲ صفحے، کاغذ و کتابت وطباعت بہتر قیمت مرقوم نہیں، پتہ، محمد ایوب صاحب اعظمی ناظم مدرسہ مفتاح العلوم جامع مسجد شاہی مئو ضلع اعظم گڈھ،

اولیاے کرام کے ملفوظات وسوانح مین ان کے بہت سے موثر اور سبق آموز اخلاقی و مذہبی واقعات، عارفانہ حقائق، اور حکیمانہ ملفوظات ملتے ہین، لیکن عموماً کشف وکرامات کے مقابلہ مین ان پر نظر نہیں جاتی، مولینا حبیب الرحمن صاحب اعظمی نے اس رسالہ مین حضرت نظام الدین اولیاء کے ملفوظ فوائد الفواد اور اخبار الاخیار شاہ عبدالحق محدث دہلوی سے بہت سے اکابر صوفیہ علماء اور اہل اللہ کے اس قبیل کے واقعات وملفوظات کو جمع کر دیا ہے، گو یہ رسالہ بہت مختصر ہے لیکن پڑھنے کے لائق ہے، اگر مولینا نے ذرا اور تفصیل سے کام لیا ہوتا، تو اس کا فائدہ اور زیادہ ہوجاتا۔

ارشادِ رسالت حصہ اول، از جناب ابوالافتخار محمد رمضان صاحب تبسم قریشی تقطیع چھوٹی ضخامت ۹۶ صفحے، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد ۵ار، غیر مجلد ۱ار، پتہ اسلامی دار الاشاعت عدا اقبال گنج، گجرات پنجاب،

مؤلف نے اس رسالہ مین اسلام، ایمان، جہاد، مان باپ سے حسن سلوک، رشتہ دارون اور تیمون سے اچھے سلوک، خوش اخلاقی اور امداد باہمی کے متعلق احادیث نبوی کا منظوم ترجمہ کیا ہے، حدیثین سب صحاح کی ہین، منظوم ترجمہ مین الفاظ کی پابندی کے ساتھ ترجمہ بہت مشکل ہی، اس لئے حدیثون کا صرف مفہوم دخشا، لے لیا گیا ہے، لیکن اس سہولت اور آزادی کے باوجود یہ نظمین بہت ناقص ہین، اور ادبی نقطۂ نظر سے مشکل سے ان پر شعر کا اطلاق کیا جاسکتا ہے، زبان نہایت خراب بلکہ غلط ہے، شعری لطافت کا تو کہین نام نہین، اس منظوم ترجمے سے صاف وسلیس نثر کا ترجمہ بہتر ہوتا، تاہم اخلاقی سبق کی حیثیت سے بچون کے پڑھانے کیلئے یہ نظمین بُری نہین ہین،

"م"

جلد ۴۷ ماہ ربیع الثانی سنہ ۱۳۶۰ھ مطابق ماہ مئی سنہ ۱۹۴۱ع عدد ۵

مضامین